

# جذبہ بیمار

روح جاوید



## جذبہ بیمار

سج بخش فیض عالم مظہر نور خدا

ناقصاں را پیر کامل، کاملاں را راہنما

اس نے دربار کی پیشانی پر لکھے الفاظ پڑھے اور پھر نظریں جھکائے اپنے ساتھی کے قدم سے قدم ملائی دروازے کے اندر داخل ہو گئی۔ دربار کی رونقیں رات گئے بھی عروج پر تھیں۔ جوق در جوق لوگ آتے، فاتحہ پڑھتے، نوافل ادا کرتے، منت کی چادریں چڑھاتے یا قوالوں کی دل موہ لینے آوازوں پر سردھنتے۔ دربار میں بے حد ہجوم تھا۔ اتنا ہجوم کہ تاحد نگاہ انسانوں کے سمندر کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ اتنا ہجوم کہ کوئی کھوجائے تو اسے تلاش کرنا مشکل ہو جائے اور وہ یہی چاہتی تھی کہ اس ہجوم میں کہیں کھوجائے۔ کوئی اسے تلاش نہ کر پائے۔ کہاں جائے گی، کیا کرے گی، اسے کچھ معلوم نہ تھا۔ بس اتنا پتا تھا کہ وہ اس ہجوم میں کھوجانا چاہتی ہے۔ یہی سوچ کر وہ اپنے ساتھی سے دو قدم پیچھے ہوئی۔ اس کا ساتھی اس بات سے بے خبر آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اب وہ دو قدم اور پیچھے سرکی..... پھر دو قدم اور..... دو قدم اور..... اور پھر وہ اسی ہجوم میں کھو گئی۔ قوالی کی تیز صدا اور لوگوں کے شور کی وجہ سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ اس کا ساتھی اسے کچھ کہنے پیچھے مڑا لیکن اسے نہ پا

کر بوکھلا ہٹ کے عالم میں آوازیں دینے لگا:

”زہرا..... زہرا بی..... زہرا..... زہرا“ لیکن یہ آواز اس کے اپنے کان بھی سننے سے قاصر تھے پھر بھلا کسی ایسے انسان تک کیسے پہنچتی جو قصداً آواز سننے سے انکاری تھا۔ پھر بھی وہ دیوانہ وار اسے پکارتا انسانوں کے ہجوم میں دوڑتا چلا جاتا تھا لیکن اسے کھونا تھا، وہ کھو چکی تھی۔

☆.....☆.....☆

”اوہ تم تو بہت خوبصورت ہو۔“ وہ اس بے ساختہ تعریف پر چونک اُٹھی۔ جو اُس کے مجازی خدا نے اُس کا گھونگھٹ اُٹھاتے ہی کی تھی۔ لوگ اکثر اس کی تعریف کرتے تھے اور اب تو اُسے عادت سی ہو چلی تھی لیکن ایسی تعریف اُسے حیران کر گئی اور اُس نے بلا ارادہ پلکوں کی باڑ اُٹھا کر دیکھا، گہری جھیل سی آنکھیں، سبز کانچ کی سی، چہرے کے مجموعی تاثر کو چھوڑ، وہ اب اُس کی آنکھوں کو دیکھتا چلا گیا جن میں دنیا بھر کی حیرت سمٹ آئی تھی، وہ سوچ میں پڑ گیا کہ چہرہ اتنا دلکش ہے یا آنکھیں، اُسے ایک نلک اپنی طرف متوجہ پا کر اگلے ہی لمحے اُس نے پلکیں جھکا دیں اور وہ ہوش کی دنیا میں لوٹ آیا۔ زبان جیسے گنگ تھی۔ اُسے عابدہ خالہ کی بات یاد آئی، ”ایک نیکی کمالے معاذ! ایک بے سہارا لڑکی سے نکاح کر لے، اللہ اجر جزیل عطا فرمائے۔“ معاذ متشکک تھا، سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا لیکن وہ عابدہ خالہ کو انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ نکاح کر لینا اتنا آسان نہیں تھا۔ زندگی بھر کا سودا، یوں بنا سوچے سمجھے کیسے کیا جاسکتا تھا۔ آخر وہ بول اُٹھا: ☆

”لیکن خالہ..... میں نے ابھی شادی کے متعلق کچھ سوچا نہیں۔“ پہلو تہی کرنا چاہی کہ اس جھنجھٹ سے نکل پائے، کسی انجان کا تصور ہی اُسے بوکھلائے دے رہا تھا، نہ جان، نہ پہچان اور عمر بھر کا سودا، بھلا شادیاں ایسے بھی ہوتی ہیں اور یہ بات بھی سچ تھی کہ اُس نے واقعی اس بارے میں کچھ نہیں سوچا تھا۔ عابدہ خالہ اُس کے جواب اور اُس کے گریز کو بھانپ گئیں۔

”مجھے تمہارا گریز سمجھ آتا ہے بیٹا! خیر میں کوئی زبردستی نہیں کروں گی۔ زمانہ بدل گیا ہے۔ بچے اپنی مرضیاں اور من مانیاں کرتے ہیں۔ تمہارے ذہن میں بھی کوئی نہ کوئی تصور تو ہوگا، اپنی شریک حیات کے متعلق۔“ بات پوری کر کے وہ سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگیں۔

”نہیں خالہ جان میرا یقین کریں آج تک میں نے کسی لڑکی کے بارے میں سوچا تک نہیں۔ میری زندگی کے ماہ و سال آپ کے سامنے ہیں پھر بھی آپ.....“ اُس کی نگاہوں میں شکوہ تھا۔ بات ادھوری رہ گئی۔ لفظ آواز کا ساتھ چھوڑ گئے۔

”نہیں بیٹا! میں تم پر شک نہیں کر رہی۔ میں نے صرف تمہاری رائے جاننا چاہی ہے۔ ظاہر ہے کبھی نہ کبھی تو تمہیں شادی کرنی ہی ہے، کچھ نہ کچھ تو سوچا ہی ہو گا ناں، خیر میں زبردستی نہیں کروں گی، سوچ لو مجھے کل بتا دینا، مجھے اُس لڑکی کا اس جمعے کو نکاح کرنا ہے، تم جانتے ہو اگلے جمعے مجھے جمیلہ کے پاس جانا ہے، میں جانے سے پہلے اس ذمہ داری سے سبکدوش ہونا چاہتی ہوں جو میرے اللہ نے مجھے سونپی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ تسبیح میں مشغول ہو گئیں۔

معاذ کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہے۔ لمحہ بھر خاموش رہا۔ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا، کتاب کھولی اور خالی ذہن کے ساتھ صفحات پلٹتے ہوئے پھر سے بند کر دی۔ ”پتا نہیں یہ نئی رشتہ دار کہاں سے وارد ہوئی ہے جس سے خالہ بیٹھے بٹھائے میرا نکاح پڑھوانے چلی ہیں، اتنا قطعی لہجہ، اتنا مان، انکار بھی نہیں کر سکتا۔“

وہ سوچتا گیا۔ عابدہ خالہ نے اُسے بچپن سے پالا تھا جب امی بابا کا ایکسیڈنٹ ہوا۔ وہ دس سال کا تھا، ڈرا سہا سا معاذ جسے عابدہ خالہ اپنے ساتھ اس گھر میں لے آئیں۔ اکثر کہا کرتیں کہ معاذ نے میری بیٹی کی کمی پوری کر دی۔ اُن کی تین بیٹیاں تھیں۔ جمیلہ، شکیلہ اور تنزیلہ۔ سب سے چھوٹی تنزیلہ باجی بھی اُس سے پانچ سال بڑی تھیں۔ ان سب کے درمیان وہ بڑی محبت سے پرورش پاتا گیا۔ خالو جان نے بھی اُسے بیٹے سے بڑھ کر چاہا اور جب وہ بیس سال کا ہوا، خالہ نے تنزیلہ باجی کی شادی بھی کر دی۔ اُس وقت خالو جان سخت بیمار تھے، کاروبار لگ بھگ ختم ہو چکا تھا۔ شادی کے اخراجات کے لیے قرض لینا پڑا لیکن سب بخیریت انجام پایا اور تنزیلہ بھی اپنے گھر کی ہوئی۔ ایک روز خالہ جان نے اُسے اپنے پاس بلایا اور اُس کے ماں باپ کا سبھی اثاثہ اُس کے حوالے کر دیا۔ بیس لاکھ کے قریب رقم تھی۔

”معاذ یہ وہ رقم ہے جو تمہارے والد کے آبائی گھر اور زمینوں سے تمہارے حصے میں آئی تھی۔ دو سال سے تمہارے تعلیمی اخراجات اسی سے ادا ہو رہے ہیں۔ پچاس ہزار کے قریب عدالت کے اخراجات تھے جو تمہارے

غاصب چچا اور تایا سے تمہارے حصے کی جنگ لڑنے میں خرچ ہوتے رہے۔“

معاذ کے ذہن میں بچپن کا وہ زمانہ فلم کی طرح چلتا رہا جب وہ اپنے چچا اور تایا کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ گھروالوں کا رویہ دھیرے دھیرے اُسے بدظن کرنے لگا۔ سچا خلوص اور محبت اپنا آپ منوالیتی ہے چنانچہ دس سالہ معاذ نے بھی خونی رشتے داروں سے منہ موڑ لیا اور محبت کے رشتوں کا دامن تھام لیا۔ اس نے خالہ جان کو فون پر رو کر فریاد سنائی کہ وہ اپنے تایا چچا کے ساتھ نہیں رہے گا۔ خالہ اور خالو جان کس مشکل سے اسے اپنے ساتھ لے کر آئے۔ بحث مباحثہ، لعن طعن، وہ خالہ کا دامن تھامے چپ چاپ سب سنتا رہا لیکن ایک ہی رٹ تھی کہ خالہ کے گھر جائے گا۔ بات قانونی چارہ جوئی تک آ پہنچی لیکن بالآخر وہ جیت گیا اور خالہ جان کے گھر آ گیا۔ جیلہ باجی نے اس روز یک بھی بنایا تھا اور اس نے یک کا ٹاٹو جیلہ باجی کی محبت میں بھیگی آواز سنائی دی، ”آج سے معاذ صرف ہمارا بھائی ہے۔“ وہ دن اور آج کا دن اسے کبھی محسوس نہیں ہوا کہ وہ غیر ہے۔ پلکوں کے گوشے ممنونیت سے بھیگنے لگے۔ خالہ کی آواز نے اسے ماضی سے حال کی طرف کھینچ لائی۔

”تمہارے خالو کی طبیعت دن بدن بگڑتی جا رہی ہے وہ چاہتے ہیں کہ اُن کی زندگی میں ہی تمہارا اثاثہ تمہارے سپرد کر دیا جائے اب تم سمجھدار بھی ہو گئے ہو اور بالغ بھی۔“

یہ الفاظ کہتے ہوئے اُن کا لہجہ بھیگ رہا تھا۔ اب وہ ایک کے بعد ایک تفصیلات سے آگاہ کر رہی تھیں جب اُنھوں نے اس رقم میں اس کی فیس کی ادائیگی کی تھی۔ کم و بیش یہ وہی دن تھے جب خالو جان کا کاروبار ختم ہوتا جا رہا تھا اور تنزیلہ باجی کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔

”بس.... خالہ جان پلیز بس کیجیے۔“ اُس سے اور سنا نہ گیا اور خالہ کے ہاتھ تھام لیے۔ ”آپ کیسا بیٹا سمجھتی رہی ہیں مجھے۔ اتنے مشکل حالات سے گزرتے ہوئے بھی آپ نے باہر سے قرض لیا اور اس رقم کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ میرے تو علم میں بھی نہیں تھا کہ میرے پاس اتنی رقم موجود ہے۔ آج مجھے آپ نے میری ہی نظروں میں شرمندہ کر دیا ہے۔“ وہ نظریں جھکائے گویا ہوا۔

”بس اب مجھے کچھ نہیں سنا۔ اس رقم سے آپ سب قرض ادا کیجیے۔ خالو جان کو اس حالت میں زیر بار نہیں دیکھ سکتا میں۔“ اُس کا لہجہ قطعی تھا۔ وہ مسکرا دیں۔ بے ریا، پر خلوص مسکراہٹ، ”قرض ادا ہو گیا ہے۔ تمہارے



خالو نے اپنی دکان بیچ کے قرض ادا کر دیا ہے، اب اُن سے کام نہیں کیا جاتا ناں اور نہ ہی کاریگروں کی نگرانی کی جاتی ہے۔ کافی مسئلے ہو رہے تھے۔“ اُسے ایک اور جھٹکا لگا۔

”اتنا کچھ ہوا اور مجھ سے کچھ کہنا بھی گوارا نہ کیا گیا۔ خالو جان نے بھی مجھے بیٹا نہیں سمجھا۔ اگر سمجھا ہوتا تو حق سے مجھے کہتے کہ دکان پر چکر لگاتے رہا کرو۔ مجھے افسوس ہے خالہ کہ آپ.....“ الفاظ کہیں کھو سے گئے اور آنکھوں میں شکوے ہی شکوے تھے۔

”نہیں معاذ! ایسا مت سوچو..... مصلحت کا تقاضا یہی تھا، کیا تم سے لاڈ پیار میں کوئی کسر چھوڑی گئی جو تم ایسا شکوہ کرتے ہو؟“ وہ سر اپا سوال تھیں۔

اُس سے کوئی جواب بن نہ پڑا اور خالہ کے بار بار اصرار پر اُس نے بینک میں اپنے نام کا اکاؤنٹ بنوا کر رقم اُس میں منتقل کر دی۔ خالو جان کے علاج کے لیے وہ مارا مارا پھرتا رہا لیکن اللہ کی مرضی کے آگے بھلا کس کا بس چلتا ہے۔ دنوں میں اُن کی طبیعت بگڑی اور وہ اپنے ابدی سفر پر روانہ ہوئے۔ اُس روز سچ سچ اُسے احساس ہوا کہ وہ یتیم ہوا ہے کیونکہ خالو جان نے اُسے کبھی بھی تنہا نہیں چھوڑا تھا، وہ اکثر اس سے باتیں کرتے رہتے، اُس کی سرگرمیوں کے بارے میں پوچھتے، مستقبل کے منصوبوں پر مفید مشورے دیتے۔ حالات حاضرہ پر بحث، کبھی موسم پر بات لیکن گھر کے حالات پر کبھی بات نہ ہوتی تھی۔ گھر میں کیا ہو رہا تھا، وہ سب کبھی کبھی آتے جاتے اُس کے کانوں تک پہنچ جاتا اور کبھی وہ خالہ سے پوچھنے کی کوشش کرتا تو اُن کا جواب یہی ہوتا۔ ”کچھ نہیں بچے! یہ سب زندگی کا حصہ ہے تم بس اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔“

خالو جان کے انتقال کے بعد اُس نے زیادہ وقت اوپر اپنے کمرے میں گزارنا شروع کر دیا نیچے اُس کا دل نہیں لگتا تھا۔ اداسی رہتی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ خالہ کے پاس اب اکثر خواتین اور لڑکیوں کی بھیڑ لگی رہا کرتی تھی۔ قرآن پاک تو وہ پہلے ہی پڑھاتی تھیں اب اکثر لڑکیاں اُن کے پاس امورِ خانہ داری سیکھنے آئی رہتی تھیں۔ اُن کا دل بھی لگا رہتا اور گھر میں رونق بھی رہتی۔ اُس نے زیادہ وقت گھر سے باہر گزارنا شروع کر دیا۔ صبح کالج، شام میں ایک دو جگہ ٹیوشن پڑھانے لگا اور ماہ بہ ماہ خالہ کے ہاتھ میں رقم رکھنے لگا جو خالہ نے کچھ پس و پیش کے بعد قبول کر لی مبادا وہ ناراض ہو جائے۔ اُسے پہلے ہی بڑے گلے تھے۔

چوڑیوں کی کھنک سے خیال در خیال کا سلسلہ تھا اور وہ ہوش کی دنیا میں لوٹ آیا۔ اُس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی کہ بقول خالہ نیکی کا اجر اُسے بڑا دل فریب ملا تھا۔

☆.....☆.....☆

”دادی.....دادی.....چاچو کے ساتھ کوئی لڑکی آئی ہے۔“ مومی کی آواز نے سب گھر والوں کو چونکا دیا۔ شبانہ نے برتن دھوتے ہوئے نظریں اٹھائیں، امینہ باورچی خانے میں ہانڈی بناتی باہر نکل آئی، صوفیہ کے کپڑے نچوڑتے ہاتھ رک سے گئے اور عذرا جہاں بیگم اپنے دفتر سے باہر آدھمکیں۔ آنکھوں سے شعلے لپک رہے تھے۔ مردوں کا سالہا چوڑا ڈیل ڈول، فریبی مائل جسامت، بے تحاشا گوری رنگت، چوڑی پیشانی، خوبصورت نقوش لیکن چہرے کی کرخنگی سے یہ خوبصورتی ماند پڑ جاتی تھی اور مجموعی تاثر بے حد غصیل اور بد لحاظ عورت کا ابھرتا تھا۔ فضیل اب برآمدہ عبور کر چکا تھا اُس کے ہمراہ چادر میں لپیٹی دہلی پتلی سی لڑکی سچ سچ چلی آرہی تھی کہ اچانک عذرا جہاں کی گھمبیر آواز پورے گھر میں گونج اٹھی اور وہ پوری جان سے کانپ گئی۔

”یہ کس کو اٹھالائے ہو فضیل۔“

”اٹھا کر نہیں لایا اماں! یقین کریں خود چل کر آئی ہے۔“ فضیل صحن کے پتھوں بچ اپنے مخصوص بے پروا انداز میں گویا ہوا۔

”یہ مرا شیوں والی بکواس نہ کر اور صاف بات بتا کون ہے یہ لڑکی اور تم سب کھڑی کیا تماشا دیکھ رہی ہو۔ اپنے اپنے کام کرو۔“ اس آواز پر اُن کی تینوں بہوئیں حیرتی سے اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئیں۔

”آپ کی بہو ہے اماں۔“ عذرا جہاں کو چار سو چالیس واٹ کا جھٹکا لگا۔ اُن کی راجدھانی میں بغاوت ہوئی تھی۔ کمر پر ہاتھ دھرے عذرا جہاں عین اُس کے سامنے آئیں اور سر تا پا اُس کا جائزہ لینے لگیں۔ وہ سوکھے پتے کی طرح تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا جیسے عذرا جہاں کی آنکھیں اُس کے وجود کے آر پار ہو رہی ہیں۔ اُس نے فضیل کی طرف بچی نگاہوں سے دیکھا۔

”چل.. نکال باہر کر.... اس چڑیل کو.... میں ایک منٹ بھی اس کو اپنے گھر میں برداشت نہیں کر سکتی۔“

عذرا جہاں نے اُس کے بغور جائزے کے بعد اپنا حکم سنایا اور اس کے چہرے کا رنگ یوں بدلا جیسے کسی نے اُس

کے اندر سے سارا کا سارا لہو نچوڑ لیا ہو۔ اُسے اپنا آنے والا وقت تاریک تر نظر آ رہا تھا وہ تو کشتیاں جلا آئی تھی۔ اب کیا ہوگا؟ اُس کے دل نے سوال کیا۔

”کیا مطلب ہے آپ کا.... بیوی ہے میری... نکاح کیا ہے... عزت ہے میری... اب کچھ بھی ہو جائے آپ کو اسے اسی گھر میں برداشت کرنا ہوگا۔“ فضیل نے اپنا قطعی فیصلہ سنایا۔ ”اور ویسے بھی آپ مجھے اس گھر سے نہیں نکال سکتیں، میرے والد صاحب کا گھر ہے، تھوڑا ہی سہی لیکن سب بھائیوں کے ساتھ اس میں میرا بھی حصہ نکلتا ہے۔“

”کیا؟“ ایک اور جھکنا منتظر تھا۔ ”کیوں ماں مر گئی ہے تمہاری جو تم اپنی زندگی کے سبھی فیصلے خود کرنے لگے ہو۔“ اُن کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اُس کا گلا دبا دیں جس کی وجہ سے اُن کا بیٹا اُن کے مقابل آکھڑا ہوا تھا اور اپنے حق کا مطالبہ کر رہا تھا۔ ”میسنی.... جادو کرنی۔“ دل ہی دل میں عذرا جہاں نے اُسے القابات سے نوازا۔ ”ہاں بس کچھ مجبوری ہو گئی کہ فوراً یہ قدم اٹھانا پڑا، ورنہ میں آپ کو بتانے ہی والا تھا،“ فضیل کا لہجہ ذرا نرم پڑا۔ ”ایسی کیا مجبوری تھی؟ اور یہ ہے کون؟ کس ذات کی ہے؟ رہتی کہاں ہے؟ کوئی آگیا پیچھا ہے کہ نہیں اس کا، آسمان سے اُتری ہے یا درخت سے اُگی ہے.... صاف صاف بتا ورنہ.....“

”بس... بس... بس آپ تو اس طرح سوال پوچھ رہی ہیں جیسے تھانے میں رپورٹ لکھوانے جانا ہے.....“ ایک خیال بجلی کی طرح اُن کے ذہن میں کوندا اور انھوں نے فضیل کی بات کاٹی۔ ”اے فضیل کہیں ایسی ویسی جگہ سے تو نہیں اُٹھالایا جہاں شریفوں کا گزر نہیں ہوتا،“ اس انکشاف پر وہ ڈھسے گئی.... جی میں آیا کہ زمین شق ہو اور وہ اُس میں سما جائے۔ وہ زور زور سے نفی میں سر ہلانے لگی۔

”اماں کیسی باتیں کرتی ہیں آپ.... شریف ماں باپ کی اولاد ہے۔ آپ ایسے الفاظ استعمال نہ کریں اس کے لیے۔“ وہ غصے میں آ گیا۔

”شریف ماں باپ.... ہوں... اتنے ہی شریف تھے تو یوں کسی لونڈے کے ساتھ کیسے چلتا کر دیا بیٹی کو.... یا یہ خود ہی گھر سے بھاگ آئی ہے تیرے ساتھ۔“

”اس کے ماں باپ اس کی شادی کسی اور کے ساتھ کر رہے تھے اور ہم ایک دوسرے کو چاہتے ہیں، مجھے یہ



گوارا نہیں تھا کہ میں اسے کسی اور کا ہوتا دیکھ سکوں اسی لیے.....“

”اسی لیے.... ہوں۔“ وہ پھنکاریں اور خود پہ قابو پاتے ہوئے گویا ہوئیں۔ ”اچھا کسی ہیرو کی چھٹی اولاد.... اب ذرا یہ تو بتا اسے رکھے گا کہاں، کھلائے گا کہاں سے، نوکری تک تو ہے نہیں تیرے پاس، خود یہ بھی خالی ہاتھ چلی آئی ہے، جہیز ایک طرف رہا، کانوں میں بالی تک نہیں ہے۔“ ایک اور غم اُنھیں ستایا۔

”نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی۔ اب دیکھیں ناں آپ کی سبھی بہوؤں میں ہے کوئی اس جیسی حسین۔ بھلا اسے ان سب چیزوں کی ضرورت بھی کیا ہے۔“ فضیل کا انداز ویسا ہی بے نیازانہ تھا۔

”بس ٹھیک ہے..... پڑھ دن رات اس کے حسن کے قصیدے، دیکھتی ہوں یہ خالی خوالی عاشقی کتنے دن چلتی ہے۔“ اُنھوں نے آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں۔ وہ بھول گئی تھیں کہ سامنے اُن کا لاڈلا اور سب سے چھوٹا بیٹا ہے، جسے وہ سب سے زیادہ چاہتی ہیں، یاد تھا تو بس اتنا کہ ان کی ریاست میں بغاوت ہوئی ہے۔

فضیل کو ان کے تیور بہت کڑے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ اس معاملے کو جتنا سادہ سمجھ رہا تھا، اتنا تھا نہیں۔ عذرا جہاں کچھ دیر خاموشی سے پُرسوج نظروں سے سامنے دیوار پر نظر جمائے رہیں اور وہ لمحات فضیل پر بہت کڑے گزرے، اُس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا کہ اگر اُس کی ماں نے کھڑے کھڑے گھر سے نکال دیا تو کہاں جائے گا۔ خالی ہاتھ، خالی جیب، نہ سر پہ ساٹبان اپنا، نہ پیروں تلے زمین اپنی۔ وہ اپنی ماں کے سخت مزاج اور بھابیوں کے ساتھ اُن کے سخت گیر رویے سے اچھی طرح واقف تھا، شبانہ بھابی کو ملنے والے طعنے آج بھی یاد تھے، جب دلا اور بھائی کی نوکری اچانک چھوٹ گئی تھی اور سال بھر اُنھیں بغیر نوکری کے گزارنا پڑا، اُس کی ماں نے اُن پر زمین کس قدر تنگ کر دی تھی اور پھر جب دلا اور بھائی نے کاروبار شروع کرنے کے لیے اماں سے رقم اُدھار لی۔ کاروبار جمنے تک اور رقم واپس ہو جانے تک، وہ اور شبانہ بھابی اس گھر کے سب سے بڑے مجرم ٹھہرائے گئے تھے اُن کی حیثیت اب جا کر بحال ہوئی تھی کہ جب دلا اور بھائی اس چھت کے نیچے رہنے کا کثیر خراج ادا کرنے کے قابل ہو چکے تھے۔ صوفیہ بھابی چونکہ اُن کی سگی بھانجی تھیں اور خوب سارا جہیز لے کر آئی تھیں اس لیے اماں کی قدرے چپیتی تھیں، اس کے باوجود وہ اُنھیں احساس دلانے سے نہ چوکتیں کہ اس گھر کی ملکہ بہر حال وہی ہیں، امینہ بھابی سب سے زیادہ عتاب کا شکار تھی کیونکہ اُس کا ساٹبان قسمت نے چھین لیا تھا،

وہ اور ان کے دونوں بچوں کے ساتھ دوسرے درجے کے شہریوں والا سلوک کیا جاتا تھا، کچھ عرصے سے امینہ بھابھی نے بھی اپنی حیثیت قدرے مضبوط کرنے کے لیے محلے دار خواتین کے کپڑے سینے شروع کر دیے تھے۔ اگرچہ اُن کی یہ کوشش عذرا جہاں کی نظروں میں ان کا مقام کچھ خاص بلند نہ کر پائی تھی، تاہم اتنا ضرور ہوا تھا کہ اب اُنھیں اور ان کے بچوں کو عذرا جہاں کے سامنے انتہائی معمولی اور ضروری احتیاجات کے لیے ذلیل و خوار نہیں ہونا پڑتا تھا۔ خاموشی کے یہ لمحے وہاں موجود ہر ذی نفس پر بھاری گزر رہے تھے، فضیل کو لگتا تھا جیسے اُس کے ساتھ بھی اب تیسرے درجے کے شہریوں کا سا سلوک ہونے والا تھا، دوسری طرف وہ لڑکی سہی چڑیا کی طرح اپنے ہی پیروں کو تکیے جا رہی تھی، امینہ اب روٹیاں ڈالتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ گھر میں آج سے ایک روٹی مزید پکا کرے گی یا فضیل کے لئے پکائی جانے والی دو روٹیوں کو بھی کم کرنا پڑے گا، شبانہ کو لگا کہ امینہ اور شبانہ پر زندگی آسان ہونے والی ہے کیونکہ اب توپوں کا رخ نئی آنے والی ہستی کی طرف موڑ دیا جائے گا، اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے اُس نے ترس آمیز نگاہوں سے اُس کے نازک وجود کو دیکھا اور دل ہی دل میں بولی، ”چچ..... بے چاری۔“ صوفیہ اس نئی صورتحال پر بے تحاشا چچ و تاب کھا رہی تھی۔ اُس کی بہن سلیمہ فضیل کو پسند کرتی تھی اور وہ وقتاً فوقتاً عذرا جہاں کے سامنے اپنی بہن کے قصیدے پڑھتی رہتی یا پھر اُن قیمتی چیزوں کی فہرست گنواتی رہتی جو اس کی ماں سلیمہ کے جہیز کے لیے اکٹھی کر رہی تھی۔ دینی سے آنے والا قیمتی اور بہترین امپورٹڈ سامان جو اُس کا بھائی ماں بہن کی فرمائش پر لے کر آیا کرتا، سونے کے بھاری زیورات، جن کی چمک عذرا جہاں کی آنکھوں میں محسوس ہوتی تھی اور صوفیہ نہال ہو جاتی لیکن آج، جو کچھ ہوا تھا اُس کے کیے کرائے پہ جیسے پانی پھیر دیا گیا تھا اُس کا بس نہیں چلتا تھا کہ اٹھا کر اسے باہر پھینک دے، اگرچہ اُس کا کام مکمل ہو چکا تھا لیکن وہ دانستاً وہیں آس پاس منڈلا رہی تھی تاکہ عذرا جہاں کا فیصلہ سن سکے۔ عذرا جہاں نے کچھ کہنے کے لیے لب واکبے اور فضیل سانس روکے اُن کے سپاٹ چہرے کو دیکھ رہا تھا کہ وہ کیا اعلان کرنے جا رہی ہیں لیکن مقابل عذرا جہاں تھیں، جن کے چہرے سے دیکھ کے اندازہ لگانا بے حد مشکل تھا کہ اُن کا دماغ کون سا جال بن رہا ہے۔



”یار بیویوں کو خوبصورت نہیں ہونا چاہیے.... خواہ مخواہ خرچا بڑھ جاتا ہے۔“ معاذ گھر لوٹتے ہی اپنے لہجے کی

مخصوص گفتگئی سے اُس سے گویا ہوا اور وہ بھی اپنے مخصوص انداز سے حیرت آنکھوں میں سموئے اُسے دیکھنے لگی کہ بھلا اخراجات بڑھنے کا اُس کی خوبصورتی سے کیا تعلق ہے، وہ تو اپنے تئیں بڑی صابروشا کرتھی۔ کبھی اپنی ضروریات کے لیے بھی تقاضا نہ کیا تھا۔ شادی کو مہینے سے اوپر ہو چلا تھا، عابدہ خالہ اور وہ کبھی اُس کو کسی چیز کی کمی نہ ہونے دیتے تھے۔ معاذ اُس سے اُس کی پسند، ناپسند پوچھ پوچھ کر تھک جاتا اور کوئی خاص جواب نہ پا کر اُس کے لیے خود ہی کوئی چیز پسند کر لیتا۔ اسی لیے کھانا رکھتے ہوئے اُس کے ہاتھ ٹھہر سے گئے اور وہ اُس کی بات مکمل ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

”ارے بھئی.... اب یہی دیکھ لو ناں.... آج مارکیٹ کچھ بکس لینے گیا تھا کہ ایک بوتیک پر ڈمی کو یہ لباس پہنے دیکھا تو بس تمہارا خیال آ گیا کہ میری زوجہ محترمہ پر یہ زیادہ سوٹ کرے گا، سولے لیا۔“ معاذ نے لباس کھول کے اُس کے سامنے لہرایا۔ پیلے اور گلابی رنگ کے خوبصورت فراک پر آسمانی رنگ کی نفیس کڑھائی سے مزین لباس واقعی شاندار تھا پسندیدگی کی چمک اُس کی آنکھوں میں لہرائی اور ہلکی سی مسکراہٹ معاذ کو اُس کے چہرے پر نظر آئی، وہ بے اختیاری میں اُس کے حسین چہرے پر جاگے رنگوں کو دیکھ رہا تھا۔

”بھلا اس کی کیا ضرورت تھی ابھی پچھلے ہفتے ہی آپ نے مجھے سردیوں کے کپڑے دلائے تھے۔“  
 ”وہی تو..... اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ بیوی کو خوبصورت نہیں ہونا چاہیے۔ جو چیز دیکھتا ہوں جی چاہتا ہے تمہارے لیے خرید لوں۔“

”تو آپ مت لایا کریں ناں کچھ بھی..... میں نے کبھی کوئی فرمائش تھوڑا ہی کی ہے۔“  
 ”آہ.... حسرت ہی رہ گئی کہ آپ بھی مجھ سے کوئی فرمائش کریں... تم خود سے فرمائش کر دو تو میں یوں سبھی کچھ اٹھا کر نہ لے آیا کروں۔“

”آپ سچ مچ چاہتے ہیں کہ میں آپ سے کچھ فرمائش کروں؟۔“  
 ”ہاں ناں.... کچھ تو فرمائش کرو.... مجھے بھی پتا چلے کہ میں بھی شادی شدگان میں شامل ہوں۔“ وہ سوچ میں پڑ گئی۔

”اچھا.... مجھے ایک موٹی سی ڈائری لادیں اور بہت اچھا لکھنے والا قلم۔“ اُس نے بہت سوچ کر کہا اور معاذ

زور زور سے ہنسنے لگا۔

”یار اتنی قیمتی چیز.... اُف تو بہ..... میں تو سوچ میں پڑ گیا ہوں کہ بھلا کیسے خرید پاؤں گا۔“ معاذ آنکھوں میں شرارت سجائے اُسے دیکھ رہا تھا جبکہ وہ اپنی مخصوص حیرانی سے دیکھنے لگی اور جب کچھ بن نہیں پڑا تو اُٹکیاں مروڑنے لگی۔

”ارے بھئی پریشان نہ ہو۔ مذاق کر رہا تھا۔ ٹھیک ہے، میں کل ہی اپنی زوجہ محترمہ کی فرمائش پوری کر دوں گا اور ہاں آئندہ بھی آپ مجھ سے کچھ نہ کچھ فرمائش کرتی رہا کیجیے... نوازش ہوگی۔“ وہ مسکرانے لگی اور قریب پڑے کپڑوں کی تہہ درست کرنے لگی۔

☆.....☆.....☆

”فضیل! میری اک بات کان کھول کر سن لے..... میں تمہیں صرف ایک مہینے کا وقت دیتی ہوں... اگر تم نوکری تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہو اور سال کے اندر اندر اوپر والے حصے میں اپنے لیے کرا بنوا لیتے ہو، تو میں اسے تمہاری بیوی تسلیم کر لوں گی، ورنہ دوسری صورت میں یا تمہیں اسے چھوڑنا ہوگا یا پھر اس کے سمیت گھر سے نکلنا ہوگا، جب تک تم اپنا کرا نہیں بنوا لیتے، یہ لڑکی امینہ کے ساتھ اُس کے کمرے میں رہے گی۔ منظور ہے تو ٹھیک ورنہ ابھی کے ابھی جاسکتے ہو یہ گھر چھوڑ کر۔“ عذرا جہاں کا لہجہ قطعی تھا۔

”ٹھیک ہے..... مجھے منظور ہے۔“ فضیل کے لہجے میں بھی ایک عزم تھا۔

”امینہ.... امینہ۔“ وہ بلند آواز میں چلا رہی تھیں اور گھر کے سنائے میں ان کی آواز درود یوار میں گونج رہی تھی۔ امینہ بوتل کے جن کی طرح حاضر ہوئی۔

”کھانا پک گیا؟“

”جی بس روٹیاں ڈال رہی ہوں۔“

”رہنے دو... آج سے یہ کام اس لڑکی کو سونپ دو... اور بھی سب کام آج سے یہی کرے گی۔ جب تک اس کا شوہر میرے ہاتھ میں مہینے کا دس ہزار نہیں رکھے گا۔ سمجھ لو یہ اس گھر کی ملازمہ ہے... ہر کام یہی کرے گی۔“ یہ بات کہتے ہوئے اُن کی نظریں فضیل کے چہرے پر تھیں جو مارے غصے کے ہونٹ کانٹ رہا تھا لیکن کچھ کہنے کا

بھی حوصلہ نہیں تھا اور مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ خاموشی اختیار کی جائے۔  
 ”کوئی اعتراض؟؟؟ فیصل!“ انہوں نے فیصل سے سوال کیا۔  
 ”جی نہیں۔“ اُس نے بے حد چبا کر لفظ ادا کیے۔

”اور تمہاری منکوحہ کو کوئی اعتراض؟“ اب اُن کی نگاہیں اُس لڑکی پر مرکوز تھیں۔ اُس نے بے بسی سے فیصل کی طرف دیکھا اور اُس کی آنکھوں کا اشارہ پا کر نفی میں سر ہلا دیا کہ اُسے کوئی اعتراض نہیں۔ امینہ اُسے باورچی خانے میں لے گئی اور فیصل چپ چاپ وہیں کھڑا رہ گیا۔ ایسی نازک صورتحال میں کچھ کہنے کا حوصلہ نہیں تھا ورنہ جو رعایت ملی تھی اُس سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا۔

عذرا جہاں کے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی، وہ آدمی فتح حاصل کر چکی تھیں۔ باقی کام آسان تھا۔ وہ جانتی تھیں کہ اُن کے جارحانہ انداز کے سامنے یہ چیونٹی زیادہ دیر نہیں ٹک سکے گی اور وہ اُسے اپنے پیروں تلے مسل دیں گی۔ بس اب انھیں ایک باقاعدہ پلان تیار کرنا تھا جس پر چل کر وہ اپنی مرضی کے نتائج حاصل کر سکیں۔

بیگم عذرا جہاں اپنے علاقے کی کونسلر ہونے کے ساتھ ساتھ میرج پیور و بھی بڑی کامیابی کے ساتھ چلا رہی تھیں اسی لیے گھر میں بھی سیاسی دائرے لڑا کر کامیابی سے برسوں گزرنے اور اولاد جوان ہونے کے باوجود حکمران بنی بیٹھی تھیں، صرف حکمران نہیں بلکہ ایک آمر کہنا مناسب ہوگا۔ یہ وصف شریف کچھ تو اُن میں فطرتی تھا اور کچھ حالات کی ستم ظریفی نے اُن کی آمریت کی زمین کو مزید زرخیز بنا دیا تھا۔ بات اُن دنوں کی ہے جب وہ بیگم عذرا جہاں کے بجائے جی جی وچولن کہلاتی تھیں۔ کم عمری میں بیاہ کے آئیں تو کھٹوشوہر اور سخت گیر ساس کا سامنا کرنا پڑا۔ پہلے پہل چپ چاپ حالات کا جائزہ لیتی رہیں اور ساس کی ڈانٹ پھٹکار سہتی رہیں ازاں بعد جب شوہر کے سدھرنے کی سبھی اُمیدیں موقوف ہو گئیں اور وہ بالترتیب دلاور، شبیر، سبحان اور فیصل کی ماں بن گئیں تو انھیں حالات کی سنگینی کا اندازہ ہونے لگا کیونکہ ساری زندگی ساس سر کی نوازشوں کے سر پر نہیں گزاری جاسکتی تھی اور ویسے بھی ساس صاحبہ اپنی بخشی ایک ایک نوازش سود سمیت وصول کرتی تھیں، ہر آئے گئے کے سامنے اپنی مظلومیت اور بہو بیٹی کی بے حسی کی خود ساختہ داستانیں سنا سنا کر عذرا جہاں کی عزت نفس پر کاری ضرب لگانے کے درپے رہتیں۔ دھیرے دھیرے جب شوہر کو سمجھانے میں مکمل طور پر ناکام ہو گئیں تو خود اپنے



پاؤں پر کھڑے ہونے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیے۔ سلائی کڑھائی کا کام شروع کیا جس میں اللہ نے برکت ڈال دی، اپنے علاقے کے ساتھ ساتھ جلد ہی گرد و نواح سے بھی کام ملنے لگا، شناسائی بڑھی تو ایک دو جگہ رشتے کروا دیے۔ اس کام میں اتنی رنگینی اور فائدہ نظر آیا کہ بالآخر سب چھوڑ چھاڑا اسی کام کو اپنا روزگار بنایا اور اسی سلسلے میں پورا پورا دن گھر سے باہر رہنے لگیں۔ آغاز میں ساس نے اعتراض کیا تو صاف آنکھیں دکھا گئیں۔ روزِ معرکہ آرائی ہونے لگی اور عذرا جہاں اپنے تئیں مطمئن کہ قصے تو پہلے ہی سناتی تھیں باہر والیوں کو، اب ذرا ان میں سچائی کا رنگ بھی شامل ہو جائے تو کیا بُرا ہے۔ سرسری ملازم تھے اُن کی ریٹائرمنٹ کے بعد جو رقم ملی وہ سر نے جھٹ مکان پر لگا کر دو منزلہ مکان کھرا کر دیا تا کہ بیٹے کو وہ روپے اللے تلے میں اڑانے کا موقع نہ ملے۔ عذرا جہاں ان سب سے بے نیاز اپنے آپ میں مگن رہیں۔ ادھر سر کا انتقال ہوا، ادھر ساس کی اکڑفوں نکل گئی اور عذرا جہاں کو کھل کھیلنے کا موقع مل گیا، شوہر کو پہلے ہی کسی گنتی میں نہیں لاتی تھیں۔ بچوں پر نظر رکھنا انھوں نے قطعی چھوڑ رکھا تھا، گھر گھر جا کر کھانا پینا، کسی کو رشتہ دکھانا، کسی سے معذرت کرنا، کسی سے وعدہ کرنا، کسی کو یونہی ٹرخانا۔ زندگی اپنے ڈھنگ سے گزر رہی تھی اور جی جی وچولن کا نام مشہور ہو رہا تھا۔ یوں ہی ایک گھرانے کے سیاسی اثر و رسوخ کے نتیجے میں علاقے کی لیڈی کونسلر کی ٹکٹ پر کھڑی ہوئیں اور اپنے وسیع تعلقات کی بنا پر الیکشن جیت گئیں پھر کیا تھا، جی جی وچولن سے بیگم عذرا جہاں کہلانے لگیں، گھر کے ایک کمرے میں شادی کا دفتر کھول لیا، اب وہ گھر گھر نہیں جاتی تھیں، لوگ اُن کے پاس آنے لگے۔ مردم شناس شروع سے ہی تھیں، اسی لیے پہلی نظر میں لوگوں کی فطرت بھی پہچان لیتیں اور اسی قسم کے لوگوں کا آئنا سامنا کروا دیتیں۔ پھر رشتہ طے ہونے پر دونوں پارٹیوں سے خوب وصولتیں۔ ساس اخیر عمر میں خون تھوکتی مر گئیں، کیا مجال کہ عذرا جہاں نے اُن کے علاج پر کوئی پیسا بھی خرچ کیا ہو۔ آتے جاتے اُسے جتنا تیں، مکافات عمل ہے، جو تم میرے ساتھ کرتی رہیں وہی آگے آرہا ہے۔ شوہر گھریلو حالات سے بدظن کسی درویش کے ڈیرے پر جا بیٹھا اور عذرا جہاں نے پلٹ کر اُس کی خبر نہ لی، زندہ ہے کہ مر گیا۔ پورا گھر اُن کی ملکیت تھا جس میں وہ اپنی مرضی سے تبدیلیاں کرتی رہیں۔ اوّل اوّل بڑا بیٹا دلا اور باپ کی محبت میں سرشار ملنے جاتا رہا۔ بعد ازاں ماں نے اُس کے ایسے لٹے لیے کہ اُس نے توبہ کر لی مصلحت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ باپ کی خالی محبت نے اُسے کیا دینا تھا، فائدہ تو

ماں کے ساتھ رہنے میں تھا۔ عذرا جہاں نے بیٹوں پر ایسی کڑی آنکھ رکھی کہ کیا مجال کسی نے کوئی بری صحبت اختیار کرنے کی کوشش کی ہو۔ ادھر واجبی سی پڑھائی سے فارغ ہوئے ادھر انھیں کسی کام پہ لگا دیا۔ سب تیر کی طرح سیدھے تھے اور اپنی ماں سے خوب دبتے تھے۔ عذرا جہاں کی حکومت سے سرتابی کرنا کسی کے اختیار میں نہ تھا۔ اب جبکہ وہ خود بال بچے دار تھے، تب بھی ماں کی پرسش پر جھوٹ نہ بول پاتے کہ انھیں لگتا اُن کی ماں کی ایکسرے مشین جیسی آنکھیں اُن کے اندر کا جھوٹ فوراً پکڑ لیں گی۔ اس ساری صورتحال کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کے لیے انھوں نے بڑی محنت کی تھی اور اب اس کا پھل پورے مزے سے کھا رہی تھیں موجودہ حالات میں جو قدم فضیل نے اٹھایا تھا اُن کے لیے کافی پریشانی کا باعث بنا ہوا تھا۔ وہ فوری طور پر اس کی سرکوبی چاہتی تھیں مبادا بغاوت کی یہ رسم چل نکلے۔

”ضیا صاحب! کچھ عرصہ پہلے میں نے آپ سے اپنے بیٹے کی نوکری کے لیے بات کی تھی۔“ اپنا فیصلہ سنانے کے بعد وہ بڑی دیر تک اپنے دفتر میں ادھر سے ادھر چہل قدمی کر رہی تھیں، سوچ بچار کے درواتھے کہ ایک خیال بجلی کی سی تیزی سے اُن کے ذہن میں لپکا اور ضیاء محمد الدین سے بات کی جوان کے پرانے واقف کار اور سیاسی اثر و رسوخ کے مالک تھے۔

”جی.... بیگم صاحبہ! مجھے یاد ہے میں بات کر چکا ہوں.... کل بس رسمی طور پر انٹرویو لیا جائے گا اور ایک دو دن میں آپ کے بیٹے کو اپائنٹمنٹ لیٹر مل جائے گا آپ.....“ عذرا جہاں نے اُس کی بات کاٹی۔

”ضیا صاحب آپ ایک بار پھر فون کرنے کی زحمت کریں اور اب کی بار آپ اُن سے کہہ دیجیے کہ فضیل بشارت کو نوکری نہیں ملنی چاہیے، وہ بھلے ہی اس نوکری کے لیے بہترین ہو۔“

”جی؟“ دوسری طرف سے خاصی حیرت کا اظہار کیا گیا۔

”جی.... بس اب ارادہ بدل گیا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ ابھی وہ مزید پڑھے، نوکری مل گئی تو پڑھنا چھوڑ دے گا۔“ عذرا جہاں نے فوری طور بات ہٹائی اور چند ایک رسمی باتوں کے بعد فون بند کر دیا۔

ریوالونگ چیئر پر خود کو گرائے، وہ آپ ہی آپ مسکرائے گئیں۔ سیاسی داؤ بیچ میں وہ خوب مہارت رکھتی تھیں اور اب وہ پوری پلاننگ کے ساتھ زندگی کی اس شطرنج پر اپنے مہرے بیٹھا رہی تھیں تاکہ ہر جانب سے جیت انھی

کی ہو اور مقابل چاروں خانے چت ہو جائے گویا ہینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ بھی چوکھا آئے۔



وہ گھر کے کاموں سے ابھی فارغ ہوئی تھی۔ کھانا پکا، صفائی ستھرائی کر، کپڑے استری کر کر اظہر پڑھ کے بیٹھی تھی، معاذ شام ڈھلے آتے تھے اور گھر کا کام تھا بھی کتنا، دو ہی تو نفوس تھے کل ملا کے، عابدہ خالہ کو اپنی بیٹی کے یہاں گئے مہینا بھر ہو چکا تھا۔ وہ اُن کے جانے کے بعد بڑی اداسی محسوس کر رہی تھی۔ عابدہ خالہ نے کہا تھا کہ وہ کچھ دن بعد چکر لگالیں گی لیکن بیٹی کی خراب طبیعت کے پیش نظر انھیں اُس کی زچگی تک وہیں رکنا پڑا۔ وہ اُن کے ساتھ بہت کم وقت رہی تھی لیکن یہ کم وقت بھی اُس کی زندگی میں بہت انقلاب لایا تھا۔ کچھ لوگوں کی شخصیت ہی ایسی ہوتی ہے، رنگدار پانی جیسی، جو اُن کے قریب رہتا اُسے اپنے ہی رنگ میں رنگ لیتے ہیں۔ عابدہ خالہ بھی ریا، مکر و فریب سے پاک ایسی ہی ہستی تھیں کہ جو اُن کے پاس بیٹھتا، اپنی اُلجھنیں سناتا اور وہ شائستگی سے اُس کی اُلجھنوں کو سلجھا کر اُسے مطمئن اور پرسکون کر دیتی تھیں۔ وہ دن اُس کی آنکھوں میں گردش کرنے لگے جب وہ نئی نئی یہاں آئی تھی اور اس گھر میں خوب رونق ہوا کرتی تھی۔ ایسا ہی ایک دن تھا، وہ اپنے غم میں نڈھال کمرے سے باہر کم ہی نکلا کرتی تھی لیکن خالہ جان کی حوصلہ افزا باتوں نے اُسے باہر آنے اور سب میں بیٹھنے کی ہمت بخشی۔ عابدہ خالہ کے پاس آٹھ دس عورتیں بیٹھی تھیں اور اپنے اپنے مسئلے بیان کر رہی تھیں۔

”آپا! سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں.... آپ جانتی ہیں اُس کی سسرال کیسی ہے۔ اب میں بھی اُس کی دلجوئی نہ کروں تو کیا کروں؟“

”ہاں تو دلجوئی کیا کرونا، اُس کے ساتھ مل کر اُس کے سسرال کی اتنی برائی نہ کرو کہ واپس جا کر اُس پر اُلٹا ہی اثر ہو۔“

”ہو ہائے! آپا اب وہ جو میری بیٹی کو ماریں تو میں کیا انھیں سر آنکھوں پہ بیٹھاؤں، نہ بابا اتنا دل گردہ نہیں ہے میرا۔“ وہ ہاتھ ہلا کے گویا ہوئی۔

”دیکھ شاہدہ! غلطی تیری بیٹی کی بھی ہے، وہ جو اپنے شوہر کے سامنے زبان درازی کرے تو کیا اُمید کرتی ہے وہ اُسے پھولوں کے ہار پہنائے گا اور صاف بات یہ ہے کہ وہ یہ سب تیری شہ پر کرتی ہے۔“

”آپا آپ تو دوسری پارٹی کی زبان بول رہی ہیں۔“ شاہدہ نے برا ماننے ہوئے کہا۔

”نہ شاہدہ... میں تو خدا لگتی کہتی ہوں... ہاں... ایک غلطی تیرے داماد کی بھی ہے کہ وہ بیوی اور ماں بہنوں کے رشتوں میں توازن نہیں رکھتا۔ یہ بھی غلط کر رہا ہے کہ وہ اُن کی باتوں میں آ کر تیری بیٹی کے ساتھ برا سلوک کرتا ہے لیکن اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ جو تم کرتی ہو وہ ٹھیک ہے بھلا؟“ اب خالہ اُس کی طرف استفہامیہ نظر ڈال رہی تھیں۔

”کیا بھلا! میں نے ایسا کیا کیا ہے؟“

”شاہدہ! ماں کا دل جاذب ہونا چاہیے ایک اسفنج کی طرح۔ جب بیٹی اپنی سسرال سے ناک ناک تنگ ماں کی چوکھٹ پر آئے تو حوصلے، صبر اور برداشت سے اُس کی سبھی باتیں سنے، اُس کے جی کا بوجھ ہلکا کرے اور پھر اُسے سمجھا بجھا کے، صبر کی تلقین کرتے ہوئے اپنے گھر چلنا کرے کہ اسی طرح بیٹیوں کے گھر بتے ہیں۔“ اُس نے کچھ سنجھی نا سنجھی کی کیفیت میں سر ہلا دیا۔

”اچھا یہ بتا کیا تو نہیں چاہتی کہ تیری بیٹی کا گھر بسا رہے؟“

”ہائے آپا کون ماں چاہے گی کہ اُس کی بیٹی کا گھر اجڑے؟“

”بس پھر اُس کے کانوں میں زہرا ٹیلنا بند کر دے، اُس کی بات سن کر اُسے اچھے مشورے دیا کر، سمجھایا کر، کہ حوصلے سے سب کی بات سنے، پیار اور صبر وہ ہتھیار ہیں جن کے ساتھ سسرال کی ہر جنگ جیتی جاسکتی ہے۔ کچھ وقت گزرے گا، سب ٹھیک ہو جائے گا اور سچ تو یہی ہے وقت گزر جاتا ہے لیکن لوگ رویے نہیں بھولتے، ابھی شروع شادی کے دن ہیں جیسی چھاپ وہاں چھوڑے گی ساری عمر دلوں پہ کبھی رہے گی، پتھر کی لکیر کی طرح۔“

”کہتی تو صحیح ہیں آپا! ٹھیک ہے اب کے میں اُسے سمجھاؤں گی لیکن اگر رو بینہ کی ساس آپ کے پاس آئے تو آپ اُسے بھی سمجھائیے گا۔“

”ہاں... ہاں ضرور۔“ خالہ نے مسکرا کے کہا۔

”آپا دعا کریں میری تنخواہ میں اضافہ ہو جائے، کچھ برکت ہو جائے، سچ پوچھیں اتنی مہنگائی ہے کہ گزر

اوقات مشکل ہو گیا ہے۔“ بتیس سالہ غزالہ نے موضوع کیا چھیڑا تو سبھی اپنے اپنے دکھ رونے لگیں، آلو پیاز کی قیمت، بجلی کے بل میں اضافہ، کپڑے لٹے کی قیمتیں اور الم غلم۔ سب اپنی اپنی بول رہی تھیں۔

”غزالہ تمہارے میاں کی نوکری لگ گئی کیا؟“ خالہ نے اُس سے پوچھا۔

”جی خالہ لگ تو گئی ہے.... مگر نہ ہونے کے برابر..... جو کماتے ہیں ہوا بھی نہیں لگنے دیتے۔ سب خرچے مجھے ہی کرنے پڑتے ہیں۔“ وہ دکھی سی گویا ہوئی۔

”بس اب آہستہ آہستہ خود سے ذمہ داریاں ہٹا کر اپنے میاں پہ ڈالنا شروع کر دو اور اپنے بجائے اپنے میاں کی تنخواہ میں اضافے اور برکت کی دعا کیا کرو۔“

”لیکن خالہ میں بھی تو گھر کے لیے ہی کماتی ہوں۔“

”تمہاری بات درست ہے لیکن یاد رکھو، عورت کی کمائی میں کبھی بھی برکت نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ اللہ نے عورت ذات کو گھر کی زینت بنالیا ہے اور مرد کو خاندان کی کفالت کا ذمہ دار مقرر کیا ہے اسی واسطے اس کی کمائی میں برکت رکھی ہے۔ وہ جتنا بھی کمائے، عورت پر لازم ہے کفایت شعاری سے اُسے خرچ کرے، ہمیشہ پیسے ہاتھ میں لیتے ہوئے بسمہ اللہ پڑھ کر لیا کرو، اللہ اُس میں برکت دے گا اور حسب استطاعت کچھ تھوڑا بہت صدقے کی غرض سے نکال لو کبھی کی نہیں ہوگی، بہتر ہے کہ روٹی تو بے پر ڈالوں تو پہلی کسی مسکین کے لیے اتار لو، اللہ کبھی بھوکا نہیں سلائے گا۔“

”تو کیا خالہ میں نوکری چھوڑ دوں؟ خرچ کیسے چلے گا؟“

”بیٹی! انسان حرص کا پتلا ہے۔ اُس کی احتیاج کبھی ختم نہیں ہوتی۔ اُس کے پاس جتنا زیادہ آئے گا اُس کی احتیاجات کا دائرہ اتنا ہی وسیع ہوتا جائے گا۔ اول اول وہ جتنے میں گزارا کرتا ہے اُس میں کچھ عرصے کے لیے چند سو کا بھی اضافہ ہو جائے تو اُسے لگے گا کہ یہ چند سو اس کی زندگی کا حصہ بن چکے ہیں ان کے بغیر اُس کا گزر ناممکن ہی ہے۔ اب یہی دیکھ غزالہ! تم گھر سے روز نکلتی ہو، روز نیا جوڑا بدلنا ہوتا ہے ہر موسم کے کم از کم بھی سات جوڑے تو چاہیے ہی ہیں، پھر گھر کے لیے ملازمہ، چھوٹے بیٹے کے ڈے کئیر کا خرچ، بچوں کی پڑھائی کے لیے ٹیوشن کا خرچ اور ایسے ہی کئی اضافی اخراجات۔ اگر تم گھر بیٹھو تو کتنی بچت ہے اور تمہارا بچہ جو آئے دن بیمار رہتا



ہے کیا وہ موئے ڈے کثیر والے اُس طرح اُس کی دیکھ ریکھ کرتے ہوں گے جس طرح تم خود کر سکتی ہو؟۔“

”کہتی تو آپ ٹھیک ہیں لیکن ایک دم سے بیس پچیس ہزار بند ہو گئے تو....“

”اللہ پہ بھروسہ رکھو غزالہ! اللہ تیرے میاں کی کمائی میں اتنی برکت دے گا کہ تجھے کوئی کمی نہ رہے گی۔ سلیقے سے خرچ کرنا بس اور پھر دیکھنا رب سوہنے کی برکت۔“ غزالہ کے چہرے پر سکون اُتر آیا۔

ایسی ہی ہیں عابدہ خالہ.... اُن کے بارے میں سوچتے ہوئے اُس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ”آج معاذ آئیں تو انھیں کہوں گی خالہ سے بات کروائیں کتنے ہی دن ہو گئے ہیں اُس سے بات ہوئے۔“ پھر اُسے اُس ڈائری کا خیال آیا جو کل معاذ اُس کے لیے لے آئے تھے۔ وہ اُسے کھولے اپنی زندگی کی کٹھی میٹھی یادیں رقم کرتی گئی۔ کچھ تلخ لمحے، کچھ کرب انگیز پل صفحہ قرطاس کی زینت بناتے ہوئے آنکھوں سے موتی لپک لپک دوپٹے اور کاغذ پر جذب ہوتے رہے۔



دن ایسے تھے کہ پر لگائے اُڑ رہے تھے۔ عذرا جہاں کی مقررہ مدت ایک ایک دن کر کے ختم ہونے کو آئی تھی۔ فضیل کا اضطراب بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ظہیر اینڈ کمپنی والوں نے اُسے نوکری پہ کیوں نہیں رکھا تھا۔ عذرا جہاں اُس کی ماں تھی اور وہ سمجھ گیا تھا کہ کمپنی والوں کا صاف لفظوں میں انکار ماں کے ساتھ اُس کی سرد جنگ کا نتیجہ ہے۔ اب دور دور تک مایوسی کے اندھیرے تھے۔ گئے چنے دنوں میں نوکری کا مل جانا اُس کے لئے کسی معجزے سے کم نہ تھا، آتے جاتے عذرا جہاں اُسے طعنے دیا کرتی تھیں۔

”اے فضیل! یہ تیری بیوی تو بڑی ہی ٹھنڈی قسمت لے کر آئی ہے۔ جس نوکری کے ملنے کی آس تھی وہاں سے بھی جواب مل گیا۔ میری مان ابھی سے چلتا کر اسے..... اس کے ہوتے تیری قسمت میں دولت نہیں ہے۔“ اور یہ سب سن کر اُسے چپ لگ جاتی۔ اپنی محبت کو پالینے کے بعد یونہی دستبردار ہو جانا آسان نہیں ہوتا۔ فضیل صبر سے ماں کی جلی کٹی سناتا رہتا، اُس پر ہونے والے ظلم کو دیکھتا اور جب ضبط جواب دے جاتا تو گھر سے باہر نکل جاتا۔ وہ بھی چپ کی ایسی داد تھی کہ کبھی منہ سے شکوہ تک نہ کیا۔ کبھی آنکھیں چار ہوتیں تو فضیل چپ کی زبان میں اُس کے سارے شکوے پڑھ لیتا اور نظر چڑا جاتا کہ اس کے سوا کبھی کیا سکتا تھا۔ وہ شگفتہ پھول دنوں

میں کھلا گیا تھا۔ آنکھوں کی چمک مانند پڑ گئی تھی۔ اکثر ہاتھوں پر جلے کے نشان نظر آتے، آتے جاتے عذرا جہاں اُس کے نازک وجود پہ دھمو کے کستی رہتیں اور وہ کسی قیدی پرندے کی طرح پھڑ پھڑا کر رہ جاتی۔ فضیل اپنے آپ کو اُس کا گنہگار تصور کرنے لگتا اور مزید تندہی سے نوکری کی تلاش میں لگ جاتا لیکن لگتا تھا قسمت بھی اُس کے حوصلے پوری طرح آزما رہی ہے۔

”فضیل۔“ فضیل اپنی ہی سوچوں کے تانے بانے میں الجھا تھا کہ اُس کی سرگوشی سنائی دی۔ پہلے تو یہی لگا کہ اُس کا گمان ہے کیونکہ عذرا جہاں کے خوف سے وہ کبھی فضیل سے بات تک نہ کرتی تھی۔

”فضیل۔“ آواز اُسے بہت قریب سے محسوس ہوئی۔ اُس نے چونک کر دیکھا وہ واقعی سامنے کھڑی تھی۔ نیم دراز فضیل سنبھل کے بیٹھ گیا۔ ”تم یہاں۔“

”ہاں.... کل سے میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔ آپ میرے گھر کی خبر لے آئیں سب کیسے ہیں۔ میں نے بہت عجیب خواب دیکھا تھا۔“ وہ جلدی سے بات ختم کر کے واپس پلٹنے لگی۔

”سنو!۔“ وہ پلٹی۔

”مجھے معاف کر دینا۔ میں اپنے لفظوں سے منکر نہیں ہوں حالات سے مجبور ہوں۔“ وہ عجیب بے ڈھنگے لباس میں تھی۔ شاید کسی بھابی کا دیا ہوا تھا۔ چادر میں خود کو لپیٹے وہ بے حد مغموم نظر آرہی تھی۔ فضیل کو بے حد ملال اور ندامت کا احساس ہوا۔

”کوئی بات نہیں۔ آپ کا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں سب سمجھ سکتی ہوں۔ یہ سب میرے اعمال کی سزا ہے۔ آپ بس ایک بار کسی طرح میرے گھر والوں کی خیریت بتادیں۔“

”ہاں ضرور.... یہ وقت سدا نہیں رہے گا۔ دیکھنا میں نے جو خواب تمہیں دکھائے ہیں اُن کی تعبیر بھی میں ہی بنوں گا۔ بس کچھ دن اور..... ایک ایک تکلیف کا مداوا کروں گا، تمہارے پیروں کے سبھی کانٹے چن لوں گا۔“

آنکھوں میں نمی بھرے اُس نے ایک نظر اُس پہ ڈالی۔ نم آلود مسکراہٹ ایک سائے کی طرح اُس کے چہرے پر آئی اور پھر کھو گئی اچانک عذرا جہاں کی گردار آواز سنائی دی جو شاید کسی بچے کو ڈانٹ رہی تھیں اور وہ پوری جان سے کانپ گئی۔ فضیل نے چاہا کہ اُس سہمی چڑیا کو کہیں چھپالے۔ وہ منظر سے غائب ہو چکی تھی لیکن فضیل ابھی بھی

اُس کے ہونے کا احساس اپنے ارد گرد محسوس کر رہا تھا۔ اُسے وہ دن یاد آیا جب پہلی بار اس کا حسین چہرہ اُس کی نظروں سے گزرا تھا اُس پہلی جھلک نے ہی اُس کے دل نے اُس کے حق میں اشارہ دے دیا تھا۔ عالیہ تنویر کی اُس سے فیس بک کے ذریعے دوستی ہوئی تھی۔ عالیہ نے اپنے کالج کے فن فیئر کی تصاویر آپ لوڈ کی تھیں انھیں میں فضیل نے اُس کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ سفید لباس میں پاکیزہ سی جھلک دیکھ کر فضیل اپنا اختیار کھوچکا تھا۔ اُسی دن سے وہ عالیہ کے پیچھے لگ گیا کہ وہ اُسے اُس کا پتا، فون نمبر کچھ تو بتائے۔

”وہ تمہارے ٹائپ کی لڑکی نہیں ہے بھول جاؤ۔“

”پھر کس ٹائپ کی ہے؟“

”بہت عجیب... کسی اور دنیا کی مخلوق ہے، کبھی بھی تم سے بات و ات نہیں کرے گی، تم اپنا ٹائم ضائع کرو گے۔“

”وہ میرا مسئلہ ہے، تمہارا نہیں... بس مجھے اُس کا نمبر چاہیے۔“

”اور اگر نہ دوں تو؟“

”کیا مطلب؟ یا تم کس کام کی دوست ہو میری؟“

”میں اُس کی بھی دوست ہوں اور جانتی ہوں وہ بہت اچھی اور الگ قسم کی لڑکی ہے، مذہبی گھرانے کی، اُن کے گھر میں ٹی وی تک نہیں دیکھا جاتا اور تم کہتے ہو میں اُس کا نمبر دے دوں تمہیں... نہیں فضیل... وہ ایسی لڑکی نہیں ہے کہ یوں ہی دوستیاں پالتی پھرے اور میں تمہیں اُس کا نمبر دے کر گنہگار نہیں ہونا چاہتی، مجھے پتا بھی نہیں چلا اُس کی تصویر کیسے آپ لوڈ ہوگئی، میں ابھی ڈیلیٹ کرتی ہوں۔“

”اس کی تصویر کا یوں انجانے میں آپ لوڈ ہونا شاید میری قسمت تھی عالیہ!... یقین کرو میں فلرٹ کی نیت سے اُس کا نمبر نہیں مانگ رہا۔ میں بے حد سیریس ہوں اس کے بارے میں... اگر پہلی نظر کی محبت کی کوئی حقیقت ہے تو سچ مجھے اُس سے محبت ہوگئی ہے۔“

”سوری فضیل میں پھر بھی اُس کا نمبر نہیں دے سکتی اور پلیز مجھ سے دوبارہ اصرار نہ کرنا۔ مجھ سے یہ نہیں ہوگا۔ وہ بہت معصوم ہے۔ وہ ایسی نہیں ہے۔“

”اچھا!..... وہ کیسی لڑکی ہے میں دودن میں ثابت کر دوں گا۔ مجھے اُس کا نمبر دو۔“

”مجھے غصہ مت دلاؤ..... اپنے چیلنجز کے لیے ڈھونڈتے رہو کسی اور کو..... میں ایک اچھی لڑکی کو اس طرح خراب نہیں ہونے دے سکتی اور اگر تم نے دوبارہ ایسی کوئی بات کی تو پھر یاد رکھنا میں تم سے دوستی نہیں رکھوں گی۔“

”اوہ..... عالیہ ناراض کیوں ہو رہی ہو یا را!..... دیکھو میں سیریس ہوں۔ مجھے فلرٹ نہیں کرنا اُس سے..... شادی کرنا چاہتا ہوں اُس سے۔“

”وہ بھی ناممکن ہے۔ اُس کے خاندان میں محبت کی شادیاں نہیں ہوتیں..... والدین کی مرضی سے ہوتی ہیں۔“

”یار کیوں سسپنس کری ایٹ کر رہی ہو..... اچھا نام ہی بتا دو ناں اُس کا..... میں خود تلاش کر لوں گا۔“

”ہا ہا ہا ہا ہا ہا ہا..... کیسے؟ اُس کے نام کی مالا جپ کے گلی گلی گھوموں گے کیا؟“

”یہی سمجھ لو..... اب تم میری مدد نہیں کرو گی تو میں جیسے مرضی اپنا مقصود پاؤں تمہیں کیا؟“

”ہوں..... کافی سنجیدہ ہو اُس کے بارے میں۔“

”ہاں مرجانے کی حد سنجیدہ ہوں۔“

”ٹھیک ہے..... ہوتے رہو پھر مجھے کیا۔“

فضیل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ وقت بھی کیا عجیب تھا۔ ایک جھلک نے خود سے بیگانہ کر دیا تھا اور عالیہ نے کتنا خوار کیا تھا۔ اُس نے تو آس ہی چھوڑ دی تھی کہ کبھی اُس سے مل پائے گا لیکن سچ ہے کہ لگن سچی ہو تو خدا بھی مل جاتا ہے اور وہ تو خدا کی مخلوق تھی۔ عالیہ نے بہت ساتھ دیا تھا ورنہ وہ کبھی بھی اُس تک نہ پہنچ پاتا۔ آج وہ خود کو جتنا بھی خوش قسمت سمجھتا، کم تھا۔ محبت سچی ہو تو آزمائشیں بھی کڑی ہوتی ہیں۔ آدھی آزمائشوں سے وہ نبرد آزما ہو چکا تھا اب کچھ ہی دن باقی تھے، ہمت نہیں ٹوٹی تھی۔ حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے وہ از سر نو تیار تھا۔

☆.....☆.....☆

”میں فجر ارمغان اپنی زندگی کے ماہ و سال پہ نظر ڈالتی ہوں تو زندگی کے میزان پر سود و زیاں کے پلڑے

دیکھنے کا حوصلہ نہیں پڑتا۔ نقصان اتنا بھاری ہے کہ اُس کا ازالہ زندگی بھر کی خوشیاں بھی نہ کر پائیں گی لیکن جب نفع کے پلڑے پہ نظر پڑتی ہے تو خود سے شرمسار ہو جاتی ہوں کہ رب تعالیٰ نے مجھے اتنا نوازا کہ جتنی میری اوقات بھی نہیں تھی۔ گویا جو زیاں ہے وہ میری اپنی غفلتوں اور بے پروائیوں کا نتیجہ ہے اور جو سود ہے وہ میرے رب کی مہربانیوں کا صلہ۔ ”میرا اللہ“ کتنا سکون آور ہے یہ احساس کہ اللہ میرا ہے۔ اللہ سب کا ہے۔ سو جتنی ہوں تو پشیمانی بڑھ جاتی ہے کہ کیسے اس احساس کے بغیر میں نے زندگی کے اتنے سال گزار دیے۔ ایسا نہیں کہ میں مسلم نہیں تھی۔ اللہ کو نہیں مانتی تھی۔ الحمد للہ ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئی ہوں۔ اللہ سے واقف تھی لیکن افسوس کہ حالات ایسے تھے کہ وہ میری شہ رگ سے بھی نزدیک تھا اور میں اسی سے نظر چراتی رہی۔ انسان کی کمزوری ہے کہ وہ خود کو مظلوم اور معصوم ثابت کرنے کے لیے بڑے طریقے سے اپنی کوتاہیوں اور غلطیوں کو حالات کے پردے میں لپیٹ کر دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے، ایک انسان خود اپنی نظر میں کبھی بھی بُرا نہیں ہوتا۔ کوئی ڈاکو، کوئی قاتل، کوئی بدکار اپنے گناہ کبھی نہیں مانتا بلکہ اُس کے پاس سود لائل ہوتے ہیں جو اُس کے امر کو درست ثابت کرنے میں مددگار بنتے ہیں اسی لیے جب کوئی برا آدمی ڈھونڈنے نکلے تو اُسے کوئی برا نہیں ملتا۔ بلھے شاہ نے کہا تھا:

”برابندہ لہن ٹریا، بُرا نہ لہیا کوئی“

اپنے اندر جھاتی ماری میتھوں بُرا نہ کوئی“

ہاں میتھوں بُرا نہ کوئی۔ میں ناشکری، نافرمان۔ خود کو برا کہنا کتنا مشکل کام ہے۔ انسان کا ہمدرد اس کی اپنی ذات کے سوا کوئی نہیں ہوتا جب انسان خود ترسی کا شکار ہوتا ہے تو اپنی کوتاہیوں کو رعایت کے لبادے میں چھپا کر برائی پر برائی کرتا چلا جاتا ہے۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا کیونکہ مجھے بھی سب ٹھیک لگ رہا تھا لیکن آج سوچوں تو ندامت سے سر جھک جاتا ہے لیکن پھر بھی خود کو اپنا ہمدرد پاتی ہوں کہیں نہ کہیں حالات بھی ذمہ دار ہیں، کہیں قسمت کا دوش، ورنہ..... آہ..... آج میں ایک مشکل کام کرنے جا رہی ہوں۔ اپنا احتساب کرنے کی کوشش، ہو سکتا ہے میں بھی کہیں نہ کہیں خود کو کچھ رعایت دے لوں کہ فطرت انسانی سے مجبور ہوں پھر بھی کوشش رہے گی کہ پوری غیر جانبداری سے یہ کام کر پاؤں۔



برسوں پہلے ہوش سنبھالا تو اپنے آپ کو ایک ایسے گھرانے میں پایا جہاں سب ہی بہت نیک تھے۔ نماز، روزہ، خیرات، کسی کام میں بھی کوتاہی سے کام نہیں لیا جاتا تھا۔ سب ٹھیک ہی تھا۔ ابو جان کی چھوٹی سی کریانے کی دکان تھی۔ ایک بڑا سا گھر تھا جس کی تین منزلیں تھیں، سب سے نچلی منزل پہ ہم، درمیانی منزل پہ بڑے چچا اور سب سے اوپر والی منزل پہ چھوٹے چچا رہا کرتے تھے۔ دونوں چچاؤں کا کپڑے کا کاروبار تھا۔ مشترکہ دکان تھی جہاں دونوں سلوک اتفاق سے کام کیا کرتے تھے۔ بہت چھوٹی عمر میں نماز کے لیے اٹھایا جاتا تھا۔ اچھا لگتا تھا کہ دن کے وقت آنکھیں ملنے ہوئے امی کے ساتھ نماز کے لیے کھڑے ہونا، دادی سے نورانی قاعدے کا سبق لینا، بھائی کی انگلی پکڑ کر سکول جانا، گھر کے کبھی بچے اکٹھے ایک ہی سکول جاتے تھے۔ بڑے چچا کا ایک بیٹا مجھ سے بڑا اور چھوٹے چچا کے دو بیٹے مجھ سے چھوٹے تھے، میرے تین بھائی کبھی بڑے تھے۔ اسی لیے گھر کی واحد بیٹی میں تھی اور دادی کی بے حد لاڈلی.... دادی ہمارے ساتھ ہی رہتی تھیں، آج بھی یاد آئے تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں کہ دادی مجھے پاس بیٹھا کر خوب کہانیاں سناتی تھیں، انبیاء کے قصے، علمائے دین کی کہانیاں۔ یہ وہ دور تھا جب مجھے یہی پتا تھا کہ اللہ سب کا ہے، ساڑھے تین سال کی چھوٹی سی عمر، دھندلی سی یادوں کے ساتھ صرف ایک آواز گونجتی ہے، میری دادی کی آواز، وہ جب فارغ ہوتیں ایک حمد بلند آواز میں وجد کے عالم میں گنگنا تیں:

تیری ذات پاک ہے اے خدا

تیری شان جل جلالہ

میں بھی اُن کے پاس آ بیٹھتی اور اُن کے ساتھ یہ حمد پڑھتی۔ دادی سردیوں کی شام اُبلے ہوئے انڈے میں سے مجھے ضرور آدھا دیتیں اور گرمیوں میں دودھ سوڈے میں سے میرے لیے حصہ رکھا کرتیں۔ میں امی کی ڈانٹ کے باوجود مقررہ وقت پر دادی کے پاس جا پہنچتی تھی۔ میں پانچ سال کی تھی جب ابو جان حج کے لیے گئے تھے۔ سب بہت خوش تھے، دادی معذور تھیں، سفر نہیں کر سکتی تھیں اسی لیے ابو جان نے دادی کے قریب آ کر اُن سے باقاعدہ اجازت لی اور دادی نے اُن کا ماتھا چوم کر اُنھیں نہ صرف اجازت دی بلکہ یہ بھی کہا کہ ہر مقام کی زیارت کرنا، میرے اللہ کے گھر جا کر میری لاچاری بیان کرنا، میرے نبی ﷺ کے روضے کو آنکھوں میں بسالینا اور میرا سلام ضرور کہنا۔ ابو جان نے چاہا کہ دادی کو بھی ساتھ لے جائیں اپنے کندھوں پہ اُنھیں اٹھا کر مناسک حج ادا

کریں لیکن ڈاکٹروں نے اجازت نہ دی کیونکہ وہ دل کی مریضہ تھیں۔ جانے سے پہلے انھوں نے مجھے خوب سارا پیار کیا تھا اور شاید آخری بار انھوں نے مجھے اتنا پیار کیا تھا اس لئے کہ جب وہ واپس آئے تو وہ بہت بدل گئے تھے۔ اُن کی ظاہری حالت میں جو تبدیلی آئی تھی، وہ اُن کی لمبی ڈاڑھی اور ماتھے پہ سلوٹوں کی صورت میں عیاں تھی جبکہ باطنی طور پر تبدیلیوں کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ یہ سب مجھ پر دھیرے دھیرے کھلا، اس لیے کہ میں یہ سب سمجھنے کے لیے بہت چھوٹی تھی۔ بس مجھے اتنا پتا تھا کہ ابا جان اب مجھے گود میں نہیں اٹھاتے تھے بلکہ پیار سے مخاطب کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ پہلے دادی کے پاس آ کر بیٹھا کرتے تھے لیکن اب انھوں نے شام کا وہ وقت کہیں اور گزارنا شروع کر دیا۔ ایک دن امی اور ابو میں کافی لڑائی بھی ہوئی امی روتی بھی رہیں، دادی سے بھی ابو کی کوئی بحث چھڑی لیکن اُس کا کوئی نتیجہ نہیں تھا، مجھے اُن کی باتیں بھی سمجھ میں نہیں آتی تھیں بس اتنا ہوا کہ اب مجھے ابو جان سے ڈر لگنے لگا۔ اُس دن کے بعد ابو جان اکثر غصے میں رہنے لگتے۔ بات بات پہ امی کو ”جہنمی عورت“ کے لقب سے نوازتے۔ دادی نے چپ سادھ لی تھی اب وہ زیادہ بات نہیں کرتی تھیں اور نہ ہی حمد پڑھتی تھیں، بس چپ چاپ بیٹھی رہتی تھیں، ایسی ہی تبدیلی چھوٹے چچا کے پورشن میں بھی دیکھنے میں آئی تھی لیکن بڑے چچا کے یہاں سب پہلے جیسا ہی تھا البتہ بڑے چچا کی ابو جان سے خوب بحث ہوا کرتی تھی اور ابو کے غصے سے ڈر کر میں دادی کے کمرے میں جا گھستی تھی اور دادی سے سوال کیا کرتی تھی ”دادی امی ابو جان کو کیا ہو گیا ہے وہ پہلے تو ایسے نہ تھے۔“ دادی امی میرا ہاتھ چومتیں اور کہتیں، ”جب انسان کی عقل پر پردہ پڑ جائے تو ایسا ہی ہوتا ہے میرے بچے۔“ مجھے اُن کی کوئی بات سمجھ نہ آئی اور پھر سوال کرتی، ”کیا ابو جان اب ہمیشہ ایسے ہی رہیں گے؟“

”پتا نہیں۔ یہ اللہ ہی جانتا ہے۔ جو اللہ کو منظور۔“

”دادی امی ابو جج کر کے آنے کے بعد ایسے ہوئے ہیں، اچھا ہوا آپ کو ڈاکٹر نے منع کر دیا تھا ورنہ آپ بھی اتنی ہی سخت ہو جاتیں۔“ اُن کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ انھوں نے مجھے سینے سے لگایا، ”نہیں بچے ایسا نہیں ہے، جج سے آ کر ہر بندہ بدلتا ضرور ہے لیکن یہ مقدر کی بات ہے جن کا جج اللہ قبول کرے اُس میں اچھی تبدیلیاں آتی ہیں اور جن کا جج قبول نہ ہو وہ.....“ دادی نے بات ادھوری چھوڑ دی اُن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے دادی کی آنکھیں صاف کیں اور اُن کے ماتھے پہ پیار کیا۔ میں نے اور کوئی سوال نہیں کیا تھا کیونکہ مجھے لگتا تھا

میرے سوال دادی کو تکلیف دے رہے ہیں لیکن یہ سچ ہے کہ اس دن میرے اندر اللہ کی طرف سے پہلی گرہ لگی تھی۔ میں دل ہی دل میں اللہ سے خفا ہو گئی تھی۔ اپنی اُس سوچ پر مجھے آج بھی پشیمانی ہے لیکن اُس وقت مجھے یہ سب ٹھیک لگ رہا تھا اور میں ایسا کرنے پہ خود کو جانبدار سمجھتی تھی۔ کچھ دنوں بعد ہم سب کو سکول سے اٹھا کر دینی مدرسے میں داخل کروادیا گیا۔ مجھے وہ مدرسہ بالکل پسند نہ تھا، وہاں بہت ڈانٹ کر سبق یاد کروایا جاتا تھا۔ اور پھر ابو جان ہم سب کو ایک جگہ لے کر گئے۔ بہت بڑا گھر تھا، کوئی درس ہو رہا تھا ایک آدمی چیخ چیخ کر کچھ بول رہا تھا، مجھے اُس کی کوئی بھی بات اچھی طرح سمجھ نہیں آرہی تھی لیکن اتنا پتا چل رہا تھا کہ وہ بار بار جہنم کی آگ کا ذکر کر رہا تھا۔ لفظ جہنم یوں بھی میرے دل و دماغ پہ نقش ہو گیا تھا کہ اب آج کل اس لفظ کا بہت استعمال کرتے تھے۔ امی کو ”جہنمی عورت“ اور بڑے چچا کو ”جہنم کا ایندھن“ کہا کرتے تھے۔ اُس آدمی نے بولنا بند کیا پورا ہال لوگوں سے کچا کھج بھرا ہوا تھا۔ اب لوگ باری باری اُٹھ کے قدم بوسی کو جا رہے تھے مرد حضرات اُس آدمی کے پیروں کو ہاتھ لگا کر اُس کا ہاتھ چوم رہے تھے جبکہ عورتیں اُن کے ساتھ بیٹھی پردہ دار عورتوں کے پاس جا کر اُن کے پیر چھوئیں اور ہاتھوں کو چومتیں۔ مجھے یہ سب دیکھ کر اچھا نہ لگا۔ یہ منظر پہلی بار دیکھا تھا۔ مذہب کے ٹھیکیداروں سے میرا پہلا تعارف تھا۔ یہاں پہنچ کر مجھے پتا چلا کہ اللہ صرف ان لوگوں کا ہوتا ہے۔ ان کی دعاؤں سے جنت اور جہنم کا تعین ہوتا ہے۔ میں دور کھڑی یہ منظر دیکھتی رہی۔ واپسی پہ ابو جان بڑے پر جوش تھے۔

”دیکھا کتنا بڑا اجتماع تھا۔ بخشش ہوئی روئیں ہیں، ان کے طفیل ہماری بخشش بھی ہو جائے گی۔ اللہ کے گھر ملاقات ہوئی میری پیر و مرشد ذکاء اللہ شاہ صاحب تھے۔ بس سمجھ لو دن پھر گئے۔ جن پر ان کی نظر کرم ہو جائے۔ اُن کے دن ایسے ہی پھرتے ہیں۔“

میں نے گھر آ کر دادی کو من و عن سب کہہ سنایا۔ دادی نے کوئی جواب نہ دیا بس ہاتھ میں پکڑی تسبیح مزید تیزی سے گھمائی شروع کر دی۔ ابو جان دادی کے کمرے میں آئے اور کہنے لگے، ”شاہ صاحب کہتے ہیں کہ آپ کو بیعت ہونے کے لیے وہاں آنے کی ضرورت نہیں آپ کا دوپٹا لے جاؤ تو آپ اُن کی مرید ہو جائیں گی۔“ دادی نے انکار کیا اور ابو بہت زور زور سے بولے، میں بھاگ گئی اپنے کمرے میں جا کر چھپ گئی پھر اچانک بالچل سی مچ گئی پتا چلا دادی کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ دادی کو ہسپتال لے جایا گیا وہ دو دن بعد واپس آئیں لیکن

بولنے کے قابل بھی نہ تھیں۔ اُنھیں فالج کا ایک ہوا تھا۔ بس بستر پہ لیٹی رہتیں اور میں ان کے پاس آ کر بیٹھ جاتی۔ مجھے دیکھ کر اُن کی آنکھوں سے پانی نکلتا اور میں ہاتھوں سے اُن کے آنسو پونچھتی رہتی۔ اب ایک اور عجیب بات ہوئی، ابوجان اناج کی بوریاں دکان میں رکھنے کے بجائے گھر کے ایک کمرے میں رکھنے لگے، میں نے امی سے وجہ پوچھی تو وہ مجھے چپ کروادیتیں یہ تمہارا معاملہ نہیں ہے۔ چپ رہا کرو ورنہ باپ سے ڈانٹ سنو گی۔ اکثر و بیشتر اباجان کی گرج دار آواز گھر میں گونجتی رہتی۔

وہ دن بھی یاد ہے جب میں مدر سے سے واپس آئی اور اباجان اور بڑے چچا کو آپس میں زور زور سے بحث کرتے ہوئے دیکھا:

”آپ ٹھیک نہیں کر رہے بھائی جان!“

”کیا ٹھیک نہیں کر رہا؟“

”کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے۔ اللہ نے ذخیرہ اندوزی سے منع فرمایا ہے، کیا ہوتا جا رہا ہے آپ کو۔“

”یہ ذخیرہ اندوزی نہیں ہے، پیر صاحب نے فرمایا ہے کہ کچھ عرصے بعد جب اناج کی قلت ہوگی تب میں یہ اناج مارکیٹ میں نکالوں گا۔ لوگوں کا بھی بھلا ہوگا اور میرا بھی۔“

”خدا کے لیے بھائی جان! خدا کے غضب سے ڈریے۔ محلے والے شکایت کر رہے تھے کہ آپ کا سامان اب تول میں بھی کم ہوتا ہے۔ کیا ہوتا جا رہا ہے آپ کو.... پہلے تو کبھی بھی آپ ایسے نہ تھے؟“

”تول میں کم..... ہوں.... جہنمی لوگ جانتے نہیں کہ میں اس مال کو خیرات کرتا ہوں۔ ہر مہینے پیر صاحب کے یہاں جو مجلس ہوتی ہے اس میں ہدیہ دیتا ہوں برکت پڑتی ہے مال میں.....“ ابوکا لہجہ عقیدت سے پر تھا اور چچا جان ان کی عقل پر ماتم کر رہے تھے۔

”اور یہ ملاوٹ کا نیا کام جو آپ نے شروع کر رکھا ہے۔ قرآن کی کس آیت میں اسے جائز قرار دیا گیا ہے یا آپ کے شاہ صاحب نے کسی آیت کی نئی تفسیر نکال لی ہے.....“

”کیا بکواس کر رہے ہو اور کون شکایت کرتا ہے، سامنے لاؤ اُسے میرے..... یہ سب حکیم نیاز محمد پھیلا رہا ہے میرے بارے میں، ذکاء اللہ صاحب کے خلاف ہیں وہ لوگ، عقیدے سے بھٹکا رہے ہیں۔ سمجھتے ہیں ایسی

باتیں پھیلا کر مجھے میرے مرشد کے خلاف کر دیں گے... ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ میرا یقین مضبوط ہے اُن پر۔ عظیم انسان ہیں وہ.... اپنے مریدوں کا خیال رکھتے ہیں۔ میری مان لے.... فرمان! مریدی اختیار کر لے.... دیکھ کیسے وارے نیارے ہوتے ہیں۔ دن پھر جائیں گے تیرے۔“ ابا جان کا اتنا کہنا تھا کہ بڑے چچا غصے سے سرخ ہو گئے۔

”معاف کیجیے گا بھائی جان! مجھے اُس ڈھونگی کی باتوں میں نہیں آنا.....“ اتنا کہنا تھا کہ ابو جان ہتھے سے اُکھڑ گئے۔ مخالفت کا ایک طوفان تھا جو اُٹا چلا آتا تھا۔ میں حسب معمول اپنے کمرے میں جا چھپی تھی۔ بڑے چچا سے قطع کلامی کر لی گئی۔ وہ سب سے الگ ہو گئے۔ وہ اپنا کاروبار بھی الگ کرنے کے بارے میں سوچنے لگے۔ باہر کا ماحول میرے اندر کے ماحول پر بھی اثر انداز ہو رہا تھا۔ غیر محسوس طریقے سے میں اللہ سے دور ہوتی چلی گئی۔ یہ بناوٹ، یہ دوغلا پن مجھ پر غالب آ رہا تھا اور نہ جانے کب یہ قبیح خیال میرے اندر جڑ پکڑ گیا کہ جب سے ہمارے گھر میں اللہ کا ذکر زیادہ ہونے لگا ہے تب سے سب برا ہو رہا ہے۔ دادی جان کا یوں ایک اکی چلے جانا، ابو اور چچا کی لڑائی، ابو جان کا اتنا بدل جانا، یہ سب انھی لوگوں سے ملنے کے بعد ہوا تھا جن کا اللہ سے ہم سے زیادہ تعلق تھا۔ بقول ابو جن کے طفیل اللہ ہماری بھی سنتا تھا۔ اولاد کے اندر پنپنے والے منفی خیالات مائیں محسوس کرتی ہیں اور ان کے تدارک کے جتن کرتی ہیں لیکن میری ماں کو اندازہ ہی نہ ہو پایا کہ میرے اندر کب بغاوت شروع ہوئی۔ وہ تو ابا کی سرد مزاجی کی وجہ سے اس قدر خائف رہنے لگیں کہ لمبے لمبے وظائف میں مصروف رہیں تاکہ ابا کا رویہ ان کے ساتھ ٹھیک رہے اور وہ دوسری شادی نہ کریں جس کی اکثر وہ دھمکیاں دینے لگے تھے۔ اپنے تئیں امی جان میری تربیت میں کوئی کسر نہ چھوڑتیں۔ گھر کی واحد لڑکی پر اپنی اپنی دانست کے مطابق پابندیاں عائد کرنا سب اپنا حق سمجھنے لگے۔ سات سال کی عمر میں پردہ کروایا گیا، سہیلیاں بنانے کی اجازت نہیں تھی۔ گھر میں ٹی وی نہیں چلتا تھا کہ نامحرم کی آواز بھی کانوں تک پہنچے، گھر میں صرف مذہبی رسائل آتے تھے۔ امور خانہ داری بھی اسی عمر میں ابو جان کے حکم سے سکھانے شروع کر دیے گئے لیکن اس سب کی وجہ سے میرے اندر بغاوت کا لاوا پکنے لگا۔ گھر کے اندر کی دنیا گھر کے باہر کی دنیا الگ کر دی گئی۔ پابندیوں کی بلند فصیلوں میں صرف مجھے مقید کیا گیا لیکن ان فصیلوں میں بھی روزن تھے، چھوٹی چھوٹی سی دراڑیں جن سے

صرف میری آنکھیں باہر کی دنیا میں جھانک سکتی تھیں اور یہیں سے بغاوت کی تیز کرنیں چھن چھن کر میرے وجود کو گرما رہی تھیں۔

☆.....☆.....☆

”سوچ لیں پھر.... فضیل کے یہاں ہوتے تو آپ اس لڑکی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ ایسا نہ ہو کہیں وہ اس لڑکی کے ساتھ اڑن چھو ہو جائے۔“ صوفیہ کی بات پر عذرا جہاں نے تیز نظروں سے اسے دیکھا لیکن دوسرے ہی لمحے چہرے پر سوچ کی لکیریں گہری ہو گئیں۔

”بات کروں پھر میں شجاع بھائی صاحب سے؟“ لوہا گرم دیکھ کر صوفیہ نے ایک اور ضرب لگائی۔  
 ”نہیں... ابھی نہیں.... شجاع سے کہو مجھ سے بات کرے اور ہاں اس چھمک چھلو کو میرے پاس بھیجو ذرا۔“  
 صوفیہ اپنے منصوبے کی ناکامی دیکھ کر اندر ہی اندر تلملا کے رہ گئی۔ وہ چاہتی تھی کہ فضیل ان کے بھائی کے پاس دبی چلا جائے اور پیچھے سے اس لڑکی کو نکال دیا جائے تاکہ اس کی بہن سلینہ کے لیے راستہ صاف ہو جائے لیکن عذرا جہاں نہ جانے کیا سوچ رہی تھیں۔ دروازے سے ہی اس لڑکی کو عذرا جہاں کے کمرے میں بھیج کر خود وہ اوٹ میں کھڑی تماشا دیکھنے لگی۔

”آپ نے بلایا مجھے؟“ وہ کچھ خائف سی دور کھڑی پوچھ رہی تھی۔  
 ”ہاں بلایا ہے تجھے.... لیلیٰ کی بھتیجی... چل ادھر آ میرے پیر دبا آ کر... ذرا تجھے بھی پتا چلے عشق و عاشقی کتنا مشکل کام ہے... بڑی ہیروئن بنی پھرتی ہے۔ تو کیا سمجھتی تھی کہ کوئی فلم چل رہی ہے۔ گھر سے بھاگے، شادی کی اور مہارانی بن کے بیٹھ گئی... ہوں... اب پتا چلے گا کہ اتنا آسان بھی نہیں ہوتا یہ سب... زور سے دبا.. ہاتھوں میں جان نہیں ہے کیا تیرے؟“ وہ چپ چاپ جلی کٹی سنتی عذرا جہاں کے پاؤں دباتی رہی اور کربھی کیا سکتی تھی۔

”باپ کیا کرتا ہے تیرا؟“

”جج... جج... جی۔“ پیر دباتی وہ بوکھلا گئی۔

”تیرے باپ کا پوچھ رہی ہوں.... پاپا... ڈیڈی... ابا... کیا جو کچھ بھی تو کہتی ہے... کوئی باپ ہے تیرا کہ نہیں....“



”جج... جی... ہے۔“

”ہے تو بکواس کر کون ہے؟“ وہ سوچ میں پڑ گئی کہ کیسے ان سے جان چھڑائے۔ فضیل نے اسے خاص تاکید کی تھی کہ وہ گھر میں کسی کو بھی اپنے خاندان کے بارے میں نہ بتائے ورنہ عذرا جہاں کے لیے ان تک پہنچنا مشکل کام نہیں۔ وہ نظریں جھکائے چپ رہی۔

”منہ سے کچھ پھوٹے گی کہ نہیں۔“ ایک زوردار طمانچہ اس کے منہ پر پڑا اور وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ پائی اسی دوران میں فضیل گھر کے اندر داخل ہوا اور ماں کی چنگھاڑتی آواز سن کر اسی کے کمرے کا رخ کیا۔ صوفیہ اسے دیکھ کر وہاں سے ہٹ گئی۔ اندر کا منظر دیکھ کر اس کا دماغ کھولنے لگا۔ وہ زمین پر پڑی ماں کی ٹھوکروں کا شکار تھی۔ اس کی دبی دبی سسکیاں، خوفزدہ نگاہیں اور چہرے پر طمانچوں کے نشان، فضیل کی برداشت جواب دے گئی۔

”یہ کیا کر رہی ہیں آپ.... مار ڈالیں گی اسے کیا؟“ وہ کانپتی ہانپتی فضیل کی اوٹ میں ہو گئی۔ فضیل نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر حوصلہ دیا۔

”ہاں مار ڈالوں گی اسے.... نفرت محسوس ہو رہی ہے مجھے اس سے.... دور ہو جا تو یہاں سے... میسنی... میری کسی بات کا جواب نہیں دیتی... گونگے کا گڑ چبائے بیٹھی ہے۔“ عذرا جہاں غراتے ہوئے آگے بڑھیں لیکن درمیان میں فضیل حائل تھا۔

”خدا کے لیے بس کر دیں... میرے کیسے کی سزا اس معصوم کو نہ دیں۔“ فضیل نے ماں کا ہاتھ جھٹک دیا۔ توپوں کا رخ فضیل کی طرف مڑ گیا۔

”تو اس چھٹانک بھر لڑکی کی وجہ سے ماں کے سامنے کھڑا ہوگا۔ دفع ہو جا یہاں سے... اور... اور اس میسنی جادو گر نی کو بھی لے جا.... دور ہو جا میری نظروں سے۔“ وہ غم و غصے سے ہانپنے لگیں۔ فضیل اسے لے کر ان کے کمرے سے باہر نکل آیا۔ عذرا جہاں نے قریب پڑا پانی کا گلاس ایک ہی سانس میں اندر اٹیل لیا۔ دماغ کی کھولن کسی طور کم نہ ہو رہی تھی۔ وہ کرسی پر ڈھکے گئیں۔ چھت پر نظریں مرکوز کیے انھیں کچھ دیر پہلے صوفیہ کی تجویز کا خیال آیا۔

” نوکری تو فضیل کو ملنی کوئی نہیں.... میری مائیں اسے شجاع بھائی صاحب کے پاس دعی بھیج دیں۔ شجاع بھائی صاحب کی کمپنی میں ایک آدمی کی ضرورت ہے۔ وہ اماں سے بات کر رہے تھے کہ پھوپھی کے بیٹے کو نوکری دلادیں گے۔ آپ کہیں تو میں اماں سے فضیل کی بات کر لوں۔“

”دماغ تو ٹھیک ہے تیرا دعی کی کمائی سے دعی مہینوں میں وہ اس لڑکی کو یہاں سے لے جانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ میں ایک ایک کر کے اس کے پر نوچ رہی ہوں اور تو اس کے اڑنے کے لیے ہوا تیز کر رہی ہے۔“

”ہاں تو دو مہینے بہت ہوتے ہیں اور فضیل یہاں نہیں ہوگا تو دس دن بھی اس کا پتا صاف کرنے کے لیے کافی ہوں گے۔“

”نہیں نہیں... میں فضیل کو دوسرے ملک نہیں بھیج سکتی۔“ ان کا دل کسی طور نہیں مانتا تھا۔ کچھ بھی تھا انھیں اپنے اس چھوٹے بیٹے سے محبت بھی سب سے زیادہ تھی۔

”سوچ لیں پھر.... فضیل کے یہاں ہوتے تو آپ اس لڑکی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ ایسا نہ ہو کہیں وہ اس لڑکی کے ساتھ اڑن چھو ہو جائے۔“

دروازہ کھلنے کی آواز پر ان کی سوچوں کا سلسلہ تھا۔ فضیل کمرے میں داخل ہوا۔ ماں نے اسے یکسر نظر انداز کیا اور آنکھیں بند کیے لیٹی رہی لیکن پھر اپنے پیروں پر دباؤ محسوس ہوا اور سسکیوں کی آواز پر وہ چونکیں۔ فضیل ان کے پیروں میں گرا رہا تھا۔

”اماں... آپ مجھے معاف نہیں کر سکتیں.... پہلی اور آخری بھول سمجھ کر معاف کر دیں۔ اسے میرے لیے قبول کر لیں... پلیز اماں.... پلیز۔“

وہ بار بار یہی الفاظ دہرائے جا رہا تھا۔ بیٹے کے آنسو دل پر گرتے محسوس ہو رہے تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ غصے میں اضافہ ہو رہا تھا کہ وہ آنسو کس کے لیے بہا رہا ہے۔ یعنی ماں سے زیادہ اسے اس لڑکی کی پروا ہے۔ ایک لمحے کے لیے موم ہوتا دل پھر سے سخت ہو گیا۔ چہرہ پاٹ تھا۔

”جا فضیل چلا جا یہاں سے.... یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔“ انھوں نے اسے پیچھے دھکیلنا چاہا۔

”اماں... پلیز اماں... میں آپ کا ہر حکم مانوں گا... کبھی آپ کے کسی عمل کے خلاف نہیں جاؤں گا۔ ایک بار

معاف کر دیں۔ صرف ایک بار۔“

”ہوں.... اچھا نوکری کا کیا بنا تیری.... کل مہینہ ختم ہونے کو آیا ہے۔ چل اٹھ یہاں سے سامنے بیٹھ میرے۔“

”پہلے بتائیں آپ نے مجھے معاف کیا کہ نہیں۔“

”پہلے میری باتوں کا جواب دے میں نے اس بارے میں ابھی نہیں سوچا۔ چل سامنے بیٹھ۔ چھوڑ میرے پاؤں۔“ فضیل ماں کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں جو کہ اس کی ناکامی کا واضح ثبوت تھیں۔ عذرا جہاں کے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔

”پھر.... کیا کرے گا اب.... وقت تو ختم ہو گیا ہے تجھے جو دیا تھا۔“ وہ ہنوز چپ تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کرے۔ بی کام کرنے کے باوجود اسے کسی معمولی سے اسٹور پر کیشیر کی نوکری بھی نہ مل سکی تھی۔ مایوسی کے بادل چاروں طرف چھائے ہوئے تھے۔

”چل ٹھیک ہے ایک چانس تجھے اور دیتی ہوں۔ اب کے دو مہینے کا وقت ہو گا تیرے پاس۔“ فضیل نے حیرانی سے ماں کا چہرہ دیکھا۔

”کیا کروں ماں ہوں ناں.... تیرے آنسو نہیں دیکھے گئے۔“ اس نے نگاہوں میں تشکر کے جذبات لیے ماں کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

”ٹھیک ہے اماں... اب کی بار میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔ ان دو مہینوں میں زمین آسمان ایک کر کے بھی نوکری حاصل کر کے رہوں گا۔“

”نہیں.... نہیں.... اب تجھے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ نوکری میں نے دیکھ لی ہے۔ دعیٰ میں شجاع کے پاس۔ بس تو جانے کی تیاری کر۔“

”دعیٰ....“ فضیل کے چہرے پر پریشانی کے اثرات نمایاں ہونے لگے۔

”ہاں دعیٰ.... دو مہینے میں کسی قابل ہو جائے گا۔ تیری اس منحوس بیوی کے بھی وارے نیارے ہو جائیں گے۔ مجھے کیا فائدہ ہوں نا ہے... تیرا ہی بھلا سوچ کربات کی ہے۔“

”لیکن اماں.....“ فضیل نے پس و پیش سے کام لینا چاہا۔

”بس بس.... فوراً جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ سوچ سمجھ کر فیصلہ کر لے۔ ورنہ اٹھا اس مصیبت کو... اور دفع ہو جا اس گھر سے... رہ فٹ پاتھ پر۔ پتا چل جائے گا کہ اس گھر کے باہر کی دنیا کتنی ظالم ہے۔ جب کھانے کو روٹی نہیں ہوگی، سر چھپانے کو ٹھکانہ نہیں ہوگا تب احساس ہوگا۔“ عذرا جہاں کا لہجہ قطعی تھا۔ اٹل ایسا کہ بات سے پلٹنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہ اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئیں اور فضیل کو سوچوں کے سمندر میں غوطہ زن ہونے کے لیے تنہا چھوڑ گئیں۔ کمرے کا سناٹا اور چھت پر چلتے پھرتے کی گڑ گڑاہٹ فضیل کے اعصاب پر سوار ہو رہی تھی۔ اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت جیسے جواب دینے لگی۔ محبت کرنا کتنا آسان ہوتا ہے، کسی کے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھانا اور بھی آسان، کسی پھول کو شاخ سے توڑ لینا بھی آسان ہے لیکن پھر اس پھول کو شاداب رکھنا کتنا کٹھن ہوتا ہے۔ اب اس کی سمجھ میں آرہا تھا۔ نہ وہ اس پھول کو شاخ سے دوبارہ جوڑ سکتا تھا اور نہ ہی ہاتھوں میں اٹھائے اس کی شادابی برقرار رکھ سکتا تھا۔ تو کیا وہ پھول کو یوں ہی مر جانے دے گا۔ ”نہیں“ اس کے اندر کہیں پر عزم آواز نے جنم لیا اور وہ کسی نتیجے تک پہنچ کر دروازے کی طرف بڑھا۔

☆.....☆.....☆

”کہاں ہے زہرا بی بی۔“ ایک زوردار تھپڑ کے ساتھ اس ادھ موئے وجود سے پھر سوال کیا گیا۔

”پپ..... پپ..... پپ..... نی..... نی..... نی۔“ ہوش میں آتے ہی سرگوشیوں کی مانند اس کے لبوں سے یہ الفاظ ادا ہوئے اور اس کی گردن پھر ایک طرف لڑھک گئی۔

”بس کر شیر دل! تھوڑا ساہ لین دے ایس نوں (سانس لینے دے اسے) مرکپ جائے گا تو لاش سے جواب لے گا کیا؟“

”ہاں... اس کی ہڈیاں توڑ کے... ان کا سرمہ بنا کر پوچھوں گا اس راکھ سے کہ زہرا کدھر ہے۔ اس کی کمین کی اتنی جرأت کہ میری بہن کو بھگا کے لے جائے۔“ بھاری بوٹ اس کی پسلیوں سے ٹکرایا اور وہ کسمسا کر رہ گیا۔

”جواناں! بس کر... مجھے بھی احساس ہے کہ تیرے اندر کیا لاوا پک رہا ہے لیکن.....“

”آپ کو احساس نہیں ہے چچا جان۔ آگ دہک رہی ہے میرے اندر اور یہ اس وقت نہیں بجھے گی جب تک

میں اس کمینی کا خون نہیں پی جاؤں گا۔“ شیردل کی سرخ آنکھوں سے شعلے لپک رہے تھے۔

”احساس ہے مجھے.... وہ تیری بہن تھی تو میری بھی ہونے والے بہو تھی۔ میرا وی دل کر رہا ایہہ اوس دے ٹوٹے ٹوٹے کر کے چیل کوؤں کو کھلاؤں کو.. لیکن بے لہیوں مر گیا تو ساری زندگی اسی آگ میں سڑ کے سوا ہوا ویاں گے اور زہرا کا نشان وی نہیں لہے گا.... حوصلہ کر شیرو.... حوصلہ وڈا کر۔“ غلام نبی نے بھتیجے کے کندھے تھپکتے ہوئے کہا۔ شیردل نے سر جھٹک کر ایک خونخوار نظر اس ادھ مرے وجود پر ڈالی اور باہر چلا گیا۔

”اوئے کریم بخش! اوئے بند کرو اوئے ایس نوں.... تے خبردار بے ایس نوں کھان پین واسطے کج دیتا تے۔“

”جی بہتر سرکار۔“ بوڑھے کریم بخش نے ہاں میں ہاں ملائی۔ غلام نبی کے جاتے ہی دروازے کو تالا لگا دیا گیا۔ قریب پڑی چار پائی پر بوڑھا کریم بخش اور حویلی کے تین چار پہرے دار بیٹھے حقے کے کش لگا رہے تھے۔ ”یہ کرم دین کو مالکوں نے کیوں بند کیا ہے چاچا۔“ پہرے داروں میں سے ایک نے بوڑھے کریم بخش سے سوال کیا۔

”مالکوں کی منطق مالک ہی جانیں یا وہ مالک جانے۔“ کریم بخش نے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ ”پھر بھی... کچھ تو سن گن ہوگی تجھے.... حویلی کی سبھی باتیں جانتا ہے تو۔“ دوسرے نے حقے کا کش لگاتے ہوئے لقمہ دیا۔

”نہ پتر... میں کچھ نہیں جانتا۔ ہم کی کمین تو آنکھ والے اندھے اور زبان والے گونگے ہوتے ہیں۔ کانوں کے ہوتے ہوئے بھی بہرے بن کے رہنے میں ہماری تمھاری بھلائی ہے۔ کسی ٹوہ میں لگ کے ہمیں کیا ملتا ہے۔ چپ رہ کر ہمارے گھروں کے چولہوں کی آگ گرم رہتی ہے۔ پیسے کا دوزخ بھرتا ہے۔ بس اک چپ سوکھ۔“ بوڑھے کریم بخش نے زندگی بھر کے تجربے کا نچوڑ پیش کیا۔

”ہاہا... آج چاچا کریم بخش ماسٹروں والی باتیں کر رہا ہے۔ پڑھے لکھے، وڈھے لوگوں جیسی باتیں۔“ اس بات پر سب نے جاندار قہقہہ لگایا۔ کریم بخش چپ رہا اور کسی گہری سوچ میں غرق سامنے مویشیوں کو چارہ کھاتے دیکھنے لگا۔

”کچھ بھی ہے کرم دین کی حالت دیکھ کر دل کو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ ادھا مویا ہوا ہے۔ بڑا بُرا حال کیا ہے مالکوں نے اس کا۔“ کہنے والے کی آواز میں کرب تھا۔ اتنے میں مقفل کمرے سے سنائی دینے والی دلدوز کراہ نے سب کو چوکنے پر مجبور کر دیا۔

”یہ تو کرم دین کی آواز ہے۔“ پہلا بولا

”اوئے کہیں مرکھپ ہی نہ گیا ہو۔“ دوسرے نے قیاس آرائی کی۔

”چاچا دیکھیں جا کر۔“ تیسرا بولا۔ کریم بخش نے پس و پیش سے کام لیا۔

”نہیں... مالکوں کا حکم ہے اسے اسی طرح بند رکھنے کا۔“

”لیکن اگر مر گیا تو۔“ چوتھے نے کہا۔

”موت آئی ہے تو بچ نہیں پائے گا۔ ہمیں اس کی آئی اپنے سر لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہمارے گھر والوں

کو ہماری ضرورت ہے۔“ کریم بخش ہنوز سختی سے گویا ہوا۔

”چاچا اک نظر دیکھنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ کل اس کی جگہ ہم میں سے بھی کوئی ہو سکتا ہے۔ وہ کل تک ہم میں

اسی طرح بیٹھا تھا۔ آج اسے ہماری ضرورت ہے۔ ایک نظر دیکھ لینے سے کچھ نہیں ہوگا۔ ہم کون سا اسے آزاد

کرنے جا رہے ہیں اور ویسے بھی ہم پانچوں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو مالکوں تک یہ خبر پہنچائے۔“ پہلے نے

پر یقین نظروں سے سب کی طرف دیکھا۔ سب کی امید بھری نظریں کریم بخش پر جم گئیں اور کریم بخش کی گرفت

چابی پر مضبوط ہو گئی۔ ابھی انسانیت کا جنازہ پوری طرح سے نہیں اٹھا۔ کہیں نہ کہیں دلوں میں خوف خدا موجود

ہے اسی لیے دنیا ابھی سلامت ہے۔ قیامت ابھی نہیں آئی۔ ”ٹھیک ہے شیدے تو میرے ساتھ چل اور تم لوگ

ادھر ہی ٹھہرو جیسے ہی کوئی آئے اشارہ کر دینا۔“ سب نے اثبات میں سر ہلایا اور پہلا، شیدانا می پہرے دار کریم

بخش کے ساتھ مقفل دروازے کی طرف بڑھا۔ اندر زخمی کرم دین جاں بلب تھا۔ لہو لہان وجود اور خشک ہونٹوں پر

زبان پھیرتے ہوئے اس نے نیم وا آنکھوں سے آنے والوں کو دیکھا۔ شناسائی کی ایک جوت جاگی اور کچھ کہنے

کو لب ہلے: ”پپ... پپ... پپ... پپ... نی... پپ...“ ایک آس تھی اس کی آنکھوں میں۔ کریم بخش نے شیدے

کی طرف دیکھا۔ شیدا باہر نکلا اور آن کی آن میں مٹی کے پیالے میں پانی لے آیا۔ کریم بخش نے اسے دروازے



پرٹھہرنے کا اشارہ کیا اور پانی کا پیالا کرم دین کے لبوں سے لگایا۔ اس نے بے تابی سے ایک ہی سانس میں سارا پیالا ختم کر لیا۔ کریم بخش نے ادھر ادھر ٹپکنے والا پانی اپنے کاندھے پر پڑی ململ کی چادر سے صاف کر دیا۔ اس گھبرو جوان کی ایسی مسلی ہوئی حالت دیکھ کر اسے بے انتہاد کھ ہوا۔ رحم پاش نگاہیں اس پر ڈالیں اور تیزی سے باہر کی طرف لپکا۔

”ایک احسان اور کر دے چا چا... م... مجھے مار دے... اب... اور درو نہیں سہا جاتا۔“ کریم بخش کی بوڑھی آنکھوں سے دو آنسو ٹپکے اور باہر نکل کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔ اندر رسیوں سے جکڑے کرم دین کی حالت نے اس کا دل موم کر دیا تھا لیکن مالکوں کا خوف اسے کچھ بھی کرنے سے باز رکھتا تھا۔ وہ اس سے زیادہ اس مظلوم کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا یا کچھ کر سکتا تھا لیکن وہ نہیں جانتا تھا۔

☆.....☆.....☆

دادی کی موت کا صدمہ گھر میں سب سے زیادہ مجھے تھا کیونکہ ان حالات میں مجھے دادی کے علاوہ اپنا ہمدرد کوئی بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ دادی فالج کی حالت میں ہفتہ بھر ہی جی پائی تھیں یوں لگتا تھا جیسے انھیں زندگی کی طلب نہیں رہی۔ وہ رات بڑی خوفناک تھی میری چار پائی دادی کے کمرے میں تھی۔ نیم تاریکی میں مجھے محسوس ہوا کہ دادی مجھے دیکھ رہی ہیں۔ باہر تیز بارش ہو رہی تھی۔ موسم سرما کی آمد کا اعلان کرتی تیز بارش۔ بجلی کڑکتی اور میں رضائی میں کچھ اور دبک جاتی۔ بند کھڑکی کی کھڑکڑاہٹ میرے خوف میں مزید اضافہ کر رہی تھی۔ میں خوف کے مارے دادی کے پاس بھی نہ جانا چاہتی تھی۔ پتا نہیں مجھے دادی سے اتنا خوف کیوں محسوس ہو رہا تھا۔ آج بھی وہ نگاہیں مجھے اپنے وجود میں اترتی محسوس ہوتی ہیں۔ دادی سے شدید محبت کے باوجود میں ان کے قریب جانے کی ہمت جمع نہیں کر پائی تھی اور پھر میری آنکھ لگ گئی۔ صبح رونے کی آوازوں سے میری آنکھ کھلی۔ امی کی بھرائی ہوئی آواز مجھے سنائی دی۔

”اٹھ فجرے دیکھ تیری دادی تجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلی گئی۔“ میں ایک جست میں چار پائی سے نکلی۔ دادی کی آنکھیں بند تھیں۔ مجھے خود پر افسوس ہوا کہ میں جاگتی آنکھوں والی دادی کے پاس کیوں نہ گئی کیوں آخری بار ان سے پیار نہ لیا۔ کیوں ان کا ہاتھ پکڑ کر چوم نہ لیا۔ آہ..... یہ کیوں..... یہ پچھتاوے ہماری ذات کا حصہ

بن جاتے ہیں... اس وقت جب وقت کھو چکا ہوتا ہے... ہم چاہ کر بھی گزرے وقت کو واپس نہیں لا سکتے۔ میں ایک آنسو بھی نہ بہا سکی۔ چپ چاپ دادی کے پلنگ کے پاس بیٹھی بین کرتی عورتوں کو دیکھتی رہی۔

”بس بیٹا صبر کر... اللہ کی مرضی کے آگے کس کا بس چلا ہے۔“ ایسے ہی جملے ہر عورت میرے سر پر پیارے دیتے ہوئے کہہ جاتی اور اللہ کی طرف سے میرے دل میں ایک اور گرہ لگ گئی۔ اللہ ایسا کیوں کرتا ہے۔ اللہ نے ایسا کیوں کیا۔ میرا واحد ہمدرد بھی مجھ سے چھین لیا۔ اب نماز کے دوران میں اکثر میں چپ ہو جاتی تھی۔ نماز کے لیے کھڑے ہونا میری مجبوری تھی اس لیے کہ اگر ایسا نہ کرتی تو ابو جان اور امی جان کی ڈانٹ ڈپٹ کا نشانہ بنتی لیکن قیام، رکوع اور سجدے میں اکثر کوتاہی ہونے لگتی۔ سوچ کے دائرے بھٹک بھٹک جاتے۔ چاہ کر بھی ارتکاز مشکل ہو جاتا۔ دل میں سختی آگئی تھی۔ کیا پڑھتی تھی کیا نہیں۔ کچھ یاد نہیں تھا۔ بس امی ابواتنا جانتے تھے کہ میں نماز ادا کر چکی ہوں۔ یہی حال قرآن کھول کر ہوتا تھا۔ کھولا اور صفحات اُلٹتے رہے۔ مجھے یاد ہے قرآن دل سے میں تب ہی پڑھا کرتی تھی جب دادی مجھے پڑھایا کرتی تھیں۔ کتنا سرور آمیز وقت تھا جب دادی کی آواز کے پیچھے آیات دہراتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی سبھی سورتیں یاد کر لیں تھیں۔ روز سونے سے پہلے وہ مجھ سے سنا کرتی تھیں اور میں اللہ سے باتیں کر کے سویا کرتی تھی۔ آج کی دعا... ہاں وہ وقت جب روز آج کی دعا مانگ کر سویا کرتی تھی اور مجھے یاد ہے کہ مجھے یقین تھا کہ اللہ میری دعا سنتا ہے۔ کیسی مضحکہ خیز دعائیں تھیں۔ یا اللہ کل میتھس کی ٹیچر نہ آئے اور جب وہ اگلے دن آئی تھیں تو روٹھے ہوئے انداز سے آسمان کی طرف دیکھا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اللہ بھی مسکرا دیا ہوگا اور پھر پتا چلا کہ میٹنگ کی وجہ سے وہ کلاس نہ لے پائیں اور میرا میٹنگ نہیں ہوا۔ میں بہت خوش ہوئی تھی۔ آسمان کی طرف دیکھ کر زور سے چلائی تھی، ”تھینک یو اللہ جی!“ میری کلاس فیلوز میری طرف دیکھ کر ہنسی تھیں اور میں تھوڑی کھسیانی سی ہو کر سر جھکائے بیٹھ گئی۔ ایسا کئی بار ہوا تھا۔ اللہ میری سنتا تھا۔ میں اللہ کے قریب تھی۔ یہ اللہ کا وہ روپ تھا جو میری دادی نے مجھے دکھایا تھا۔ انھوں نے بتایا تھا کہ اللہ دوست ہے، ہماری شہ رگ سے قریب ہے، ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہے، ہر وقت سنتا ہے، ہر لمحہ سنتا ہے، غلطی پر ناراض ہوتا ہے لیکن توبہ کرنے پر مان جاتا ہے۔ اس سے کچھ کہنا ہے تو نماز پڑھو، اس کی سنی ہے تو قرآن پڑھو۔ وہ بات کرے گا۔ راہ دکھائے گا، غلط راستے سے ٹوکے گا، صحیح راستے پر راہنمائی کرے گا۔ یہ تعلق اور بھی مضبوط

ہو جاتا اگر سب کچھ بدل نہ جاتا لیکن ابوجان نے کسی اور اللہ سے متعارف کروایا۔ وہ اللہ جو عام انسان سے بہت دور ہے، جو صرف پیر صاحب کی سنتا ہے، اسی کے وسیلے سے ہم اللہ کو پا سکتے ہیں، پیر صاحب سفارش کریں تو دعائیں سنی جائیں گی ورنہ اللہ نہیں سنے گا، پیر صاحب کی خوشنودی سے اللہ نوازے گا اور پیر صاحب کے غضب سے اللہ چھین لے گا۔ دادی نے پیر صاحب کی بیعت سے انکار کیا تو ان پر فالج اتر آیا اور وہ چلی گئیں۔ میں اللہ سے دور ہو گئی کیونکہ مجھے پیر صاحب پسند نہیں تھے نہ ان کی خوشنودی سے دلچسپی تھی۔ اب نماز پڑھتے ہوئے اللہ سے بات کرنا مقصود نہ تھا صرف امی کو بتانا مقصد تھا کہ میں نے نماز پڑھ لی۔ قرآن کھول کر خالی ذہن کے ساتھ عربی کے الفاظ دہراتی کیونکہ اب اللہ کی بات سننے کی حاجت نہیں تھی۔ اس لیے کہ اللہ کی جو باتیں میں ہر مہینے درس میں پیر صاحب کی زبانی سنتی تھی انھیں سننے کے بعد مجھے اللہ سے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ دانستاً میں اللہ سے نظریں چرانے لگی تھی۔ جب ہر عمل کے بعد جہنم کا ایجنہن ہی بننا ہے تو کچھ کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ جنت کے حقدار صرف وہ لوگ ہیں جو پیر ذکاء اللہ کے قریب ہیں۔ جو اس کا حکم مانتے ہیں۔ یہ نقش ہر گزرتے دن کے ساتھ میرے دل و دماغ میں گہرا ہوتا چلا گیا اور میں ہر اس کام میں کشش محسوس کرنے لگی جس سے مجھے ابومنع کرتے تھے۔ ان میں سے ایک کام چھپ کر ٹی وی دیکھنا بھی تھا۔ یہ کام میں تب کرتی تھی جب ابو اور بھائی دکان پر اور امی چچی جان کے پاس باتیں کرنے جاتی تھیں۔ کیبل کے ہوتے ہوئے بھی گھر میں چند منہ ہی چینلوں کے سوا کچھ لگانے کی اجازت نہ تھی وہ بھی ابو اور بھائی لگایا کرتے تھے۔ انھی میں سے ایک چینل پر پیر صاحب کے یہاں ہونے والی محفل اور درس کی فلم بھی ٹیلی کاسٹ کی جاتی تھی جسے گھر والے بڑی عقیدت کے ساتھ دیکھتے تھے۔ حیرت ہے اس وقت ابو کو یہ خیال نہیں آتا تھا کہ گھر کی خواتین غیر مردوں کو دیکھ رہی ہیں۔ یہ دہرا معیار ہر معاملے میں برتا جاتا تھا جیسے پیر صاحب کے گھر کے کسی فرد کے سامنے عورتوں کو پردے کی حاجت نہیں۔ بھلا وہ غیر محرم نہیں تھے۔ یہ سب مجھے پاگل کر دیتا اگر مجھے پرائیویٹ میٹرک کرنے کے بعد کالج جانے کی اجازت نہ ملتی۔ مجھے کالج جانے کی اجازت ملنا بھی ایک معجزے سے کم نہ تھا۔ یہ ایک الگ قصہ ہے لیکن اس سے پہلے ایک اور حادثہ گزرا جس نے میری زندگی کی کتاب میں منفی سوچوں کے کئی اور نقش چھوڑ دیے۔



”نہیں.... میں یہاں اکیلی نہیں رہوں گی۔“ فضیل کی بات سن کر وہ چلا اٹھی۔

”اوہو... اتنا گھبرا کیوں رہی ہو۔ میں ہمیشہ کے لیے نہیں جا رہا۔ صرف دو مہینے کی بات ہے۔ میں اتنا کمانے لگوں گا کہ تمہیں بھی اپنے پاس بلا لوں گا اور ویسے بھی امی کو پیسوں سے غرض ہے۔ انہیں پیسے ملنے لگیں گے تو تمہارے لیے بھی زندگی نسبتاً آسان ہو جائے گی۔“ فضیل نے اسے سمجھانا چاہا۔

”ہاں دو مہینے تک میں زندہ رہوں گی تو یہ سب ہوگا۔“ بے ساختہ اس کے لبوں سے ادا ہونے والے لفظوں نے فضیل کا جیسے لہو نچوڑ لیا۔ اس نے اسے کندھوں سے تھاما اور اپنی طرف رخ کر کے بولا:

”آئندہ یہ الفاظ تمہارے منہ سے نہ سنوں۔ تم... تم نہیں جانتی کہ تم میرے لیے کیا اہمیت رکھتی ہو۔ اگر تم نہ رہی تو شاید میری زندگی کا بھی کوئی مطلب نہیں رہے گا۔ قسمت کا کھیل ہے ورنہ میں نے ایسا نہیں سوچا تھا۔ میں تمہیں تمہارے اور اپنے گھر والوں کی رضامندی سے اپنانا چاہتا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ میری ماں کی طبیعت کیسی ہے لیکن تم جانتی ہو حالات کیا رخ اختیار کر چکے تھے اور تمہارے اصرار پر ہی یہ سب ہوا ہے۔ اب ہمت کیوں ہار رہی ہو۔ ہم دونوں جانتے تھے کہ اس قدم کے اٹھانے کے بعد زندگی آسان نہیں ہوگی۔“

فضیل کی بات سن کر وہ کچھ نہ کہ پائی۔ اسے پتا تھا کہ اسی نے فضیل کو اس حد تک جانے کے لیے کہا تھا لیکن اس کے پاس بھی اور کوئی راستہ نہ تھا۔ وہ اپنی زندگی کا پہلا اور آخری جوا کھیل چکی تھی اور اسے پتا تھا کہ وہ یہ چال قسمت کے ہاتھوں بری طرح ہار چکی ہے۔ اس کی حالت ہارے ہوئے اس جواری سے مختلف نہیں تھی جو سب کچھ ہارنے کے بعد اپنی زندگی کی بازی لگا رہا تھا اور اب یا تو ہار ہوا سب کچھ اسے واپس ملنے والا تھا یا وہ زندگی بھی ہار جاتا۔ بس یہی بات اسے سکون دیتی تھی کہ عزت داؤ پر لگانے کے بعد اب اپنی زندگی خود اپنے ہاتھوں سے ختم کرنا اس کے لیے زیادہ مشکل ثابت نہ ہوتا۔ فضیل کا وجود اس گھر میں اس کے لیے واحد ڈھال تھا، کمزور سہی لیکن اسے اطمینان تھا کہ اس کے ہوتے یہاں اس کے ساتھ کچھ بھی غلط نہیں ہوگا۔ وہ سب ظلم خاموشی سے سہہ لیتی تھی لیکن اسے محسوس ہو رہا تھا کہ فضیل کے سبھی دعوے ماں کے سامنے سمندر کی جھاگ ثابت ہوتے تھے۔ حقیقت یہی تھی کہ بنا نوکری کے وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی حیثیت غیر مستحکم تھی۔ وہ دونوں خاموش ایک دوسرے سے نظریں چرائے آسمان پر اڑتے پرندوں کو دیکھ رہے تھے۔ وہ چھت پر کپڑے پھیلائے آئی تھی اور

اسے اوپر جاتے دیکھ کر فضیل بھی اوپر چلا آیا تھا کہ گھر میں واحد گوشہ یہی تھا جہاں وہ دو گھڑی بات کر سکتے تھے۔ فضیل نے دئی جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ آنے والے وقت سے اچھی امید رکھتا تھا لیکن اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اب اس سے بھی برا کچھ ہونے والا ہے جتنا برا اب تک ہو چکا تھا۔

”میرے گھر والوں کی کچھ خبر ہے؟ تم گئے تھے اس محلے میں؟“ طویل خاموشی کے بعد اس نے سوال کیا۔ یہی وہ سوال تھا جس سے فضیل بچتا چاہتا تھا اور وہ پچھلے ایک ہفتے سے اس سوال سے کامیابی سے بچ رہا تھا۔ آج بھی اگر اسے اپنے جانے کی خبر دینا مقصود نہ ہوتا تو شاید وہ کبھی اوپر نہ آتا اور ہمیشہ کی طرح اسے نظر انداز کر دیتا۔

”کیا جاننا چاہتی ہو تم؟“ اس نے الٹا سوال کیا۔

”کوئی بری خبر ہے؟“ اس کا دل بے اختیار دھڑکا۔

”تمہیں اچھی خبر کی امید تھی؟“

وہ محسوس نہ کر پائی کہ فضیل کے لہجے میں سوال ہے یا طنز۔ وہ نظر جھکا کر رہ گئی۔

”تم مجھ سے تنگ آ گئے ہو؟“

”نہیں تو۔“

”پچھتا رہے ہو؟“

”اوہوں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”مجھے محسوس ہوتا ہے۔“ وہ کچھ توقف سے پھر بولی، ”یا شاید ابھی محسوس ہوا۔“

”ایسا کچھ نہیں ہے۔ بس میں تمہیں اور تکلیف نہیں دینا چاہتا۔ محبت بھرے الفاظ بھی اچھے وقتوں کے محتاج

ہوتے ہیں۔ برے وقتوں میں الفاظ مرجاتے ہیں صرف رویے رہ جاتے ہیں۔“

”ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔ صرف اتنا بتا دو۔ میری ماں....“ فضیل نے اس کی بات کاٹ دی۔

”صرف تمہاری ماں نہیں رہی۔ باقی سب کچھ وہیں ہے۔“ اس نے بے یقینی سے فضیل کی طرف دیکھا۔ وہ

نظر چرا گیا پھر اسے اپنی کلائی پر اس کے دونوں ہاتھوں کا دباؤ محسوس ہوا جو رفتہ رفتہ بڑھنے لگا۔ شاید ضبط کی کوشش

تھی اور پھر ضبط کے بند ٹوٹ گئے وہ اپنے گھٹنوں میں سر دیے سسکیاں بھرنے لگی۔ فضیل نے کچھ کہنے کے لیے لب واکیے اور پھر کچھ کہے بنا سامنے دیوار کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اس کے پاس ہمدردی کے دو بول بھی نہیں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ اچھی طرح رو لے۔ یہ مختصر وقت بھی غنیمت تھا جب تک کسی کو اس کے اوپر ہونے کا احساس نہیں تھا۔ پھر عذرا جہاں کی آواز پر پلٹ کر اس نے دیکھا:

”کیوں ری سارے کام چھوڑ کر یہاں ٹسوے کیوں بہا رہی ہے؟ ماں مر گئی ہے کیا تیری؟“ عذرا جہاں نے اسے بالوں کی چوٹی سے جکڑ کر اوپر اٹھایا تھا۔ اس سے پہلے کہ فضیل اسے بچانے کے لیے آگے بڑھتا۔ اس کے نازک وجود میں جیسے طاقت آگئی۔ اس نے عذرا جہاں کا بازو زور سے جھٹکا اور چلاتے ہوئے گویا ہوئی:

”ہاں.. ماں مر گئی ہے میری۔“ اتنا کہ کروہ تیزی سے نیچے کی طرف بھاگی۔ یہ سب اتنا اچانک اور جلدی ہوا تھا کہ عذرا جہاں، ان کے پیچھے آتی صوفیہ اور فضیل کچھ لمحوں کے لیے کچھ سمجھ نہ پائے کہ اس مہین وجود میں اتنی طاقت کہاں سے آگئی۔ عذرا جہاں حیران سی ہوا میں معلق اپنے ہاتھ کو دیکھ رہی تھی جس پر ابھی بھی سنساہٹ محسوس ہو رہی تھی۔



رات کے پچھلے پہر مقفل دروازہ پھر سے کھلا۔ کریم بخش ہاتھ میں کھانے کی تھالی اور پانی کا گلاس لیے اندر داخل ہوا۔ کرم دین کے بندھے ہوئے وجود میں حرکت ہوئی اس نے نظر اٹھا کر کریم بخش کو دیکھا اور پھر سر جھکا دیا کہ اس کے وجود میں بس اتنی ہی طاقت تھی۔ کریم بخش نے ہاتھوں سے نوالے بنا کر اسے کھانا کھلانا شروع کیا۔ وہ ممنون نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ سرگوشیوں میں باتیں ہونے لگیں۔

”تو مان کیوں نہیں جانا مالکوں کی بات... جو وہ پوچھتے ہیں بتا کیوں نہیں دیتا۔ کیوں جان کا دشمن ہوا بیٹھا ہے۔“ کریم بخش نے اسے سمجھانا چاہا۔

”جان کسے پیاری نہیں چاہا... بتا دیا جو جانتا تھا اور کیا بتاؤں۔ غیب کا علم صرف رب جانتا ہے۔“ اس کے الفاظ میں اتنی طاقت ان نوالوں کے طفیل تھی جو ابھی کریم بخش نے اسے کھلائے تھے۔ کریم بخش نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔



”رب دی سوں چا چا! میں بی بی کو داتا کے دربار لے کر گیا تھا اس نے کوئی منت پوری کرنی تھی۔ واپسی پر وہ پتا نہیں کدھر غائب ہو گئی۔ میں نے بہت ڈھونڈا... نہیں ملی۔ کیا مجھے نہیں پتا تھا کہ اس کے بغیر حویلی آنے کے بعد میرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا؟“ کریم بخش ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

”خود بھی وہیں رہ جاتا بد بخت! کیوں آیا تھا واپس اکیلے؟“

”نمک کھایا تھا چا چا... نمک حلالی کھینچ لائی واپس۔“

”ہوں... وڈا نمک حلال... کر دیا نمک کا حق ادا... آ گیا مزا... مرے گا اب تو...“

”تو مار دے چا چا... ایک ہی دفعہ مار دے... ان کی مار نہیں کھائی جاتی۔ یہ دیکھ رسیاں کھال میں کھب گئی ہیں۔ بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ اللہ قسم! نہیں سہی جاتی۔“ کریم بخش نے اس کی رسیاں تھوڑی ڈھیلی کر دیں۔ ”کل حکیم صاحب سے دوائی بنوا کے لاؤں گا کھالینا تکلیف کم ہو جائے گی۔ کوئی مرہم نہیں لگا سکتا ان کو نظر آ گیا تو اچھا نہیں ہوگا۔“

”حکیم صاحب سے زہر بنوا کے لا دے چا چا... میرے اگے پیچھے کوئی رونے والا نہیں ہے... جین سے مروں گا۔“ کریم بخش نے تیز نظروں سے اسے دیکھا۔

”ہاں تیرے اگے پیچھے تو کوئی نہیں ہے لیکن میرے اگے پیچھے رونے والے ہیں۔“ وہ برتن اٹھا کر دروازے کی طرف چل دیا۔ سناٹے میں بڑی دور تک کرم دین کی آواز اس کا تعاقب کرتی رہی۔

”چا چا... مجھ پہ احسان کر دے چا چا... مجھے زہر دے دے... میری جان چھڑا دے اس عذاب سے... چا چا... چا چا۔“

☆.....☆.....☆

معاذ مٹھائی کا ڈبالیے گھر میں داخل ہوا تو وہ ہمیشہ کی طرح سب کاموں سے فارغ ہو کر اپنی ڈائری میں گم تھی۔ معاذ نے دھیرے سے، چپکے سے آکر اسے ڈرایا۔ وہ پوری جان سے کانپ گئی۔

”اُف... آپ نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔“ وہ پلٹی تو بے اختیار اتنا ہی کہہ پائی۔

”ارے نہیں تمہاری جان نہیں نکل سکتی اس لیے کہ وہ میری قید میں ہے۔“ وہ مسکرا کے رہ گئی اس بات کا اس

کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

”مجھے پتا ہوتا ناں کہ تم دن رات اسی ڈائری میں گم رہو گی تو میں کبھی بھی تمہیں یہ لا کر نہ دیتا۔“

”نہیں تو... دن رات تو نہیں۔ صرف اس وقت جب سب کاموں سے فارغ ہوتی ہوں۔“

”جھوٹ کل رات بھی لیپ جلا کر تم اس میں کچھ لکھ رہی تھیں۔“

”آپ تو سو رہے تھے۔“

”روشنی کی وجہ سے جاگ گیا تھا۔“

”اوہ... میں نے تکیہ آگے رکھا تھا لیپ کے.... مجھے نہیں پتا تھا آپ تک روشنی پہنچ رہی ہے۔ آئندہ احتیاط

کروں گی۔“ وہ شرمندہ دکھائی دے رہی تھی۔ معاذی مگر ادا یا۔

”کوئی بات نہیں... ویسے اگلی بار کیا احتیاط کرو گی۔“

”باہر چلی جاؤں گی۔“

”ٹھنڈ میں... کوئی ضرورت نہیں... مجھے اتنی سی روشنی کچھ نہیں کہتی۔“ وہ پھر چپ ہو گئی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا

کیا کہے۔

”ویسے اس ڈائری میں کیا لکھ رہی ہو۔“

”کچھ خاص نہیں... بس کوئی بات کرنے کے لیے نہیں ہوتا ناں اسی لیے یوں ہی کچھ لکھتی رہتی ہوں بے

سرو پاتیں۔“

”لاؤ ہم بھی تو پڑھیں ذرا۔“ معاذی نے ڈائری پکڑنا چاہی۔

”ارے نہیں.....“ وہ بوکھلا گئی اور اس سے پکڑ لی۔ ”یہ... یہ مٹھائی کس خوشی میں؟“ اس نے ایک طرف

رکھا ہوا مٹھائی کا ڈبہ دیکھا اور بات کا موضوع بدل دیا۔

”ہا ہا ہا ہا...! اچھا طریقہ ہے بات بدلنے کا۔ ٹرینڈ بیویوں والی عادتیں اپنا رہی ہو۔ ویسے یہ مٹھائی اس خوشی

میں ہے کہ جناب کے سر تاج کے ایم بی اے کے لاسٹ سمسٹر کا رزلٹ آچکا ہے اور مابدولت بہت اچھے نمبروں

سے پاس ہوئے ہیں۔“ اس نے مٹھائی کا ڈبا کھولتے ہی اس کے منہ میں گلاب جامن کا چھوٹا پیس ڈالتے ہوئے

بات مکمل کی۔ وہ اس اچانک حملے کے لیے تیار نہیں تھی۔ خوشی کا اظہار کرنا چاہتی تھی لیکن منہ مٹھائی کی وجہ سے بند ہو چکا تھا البتہ آنکھوں میں خوشی کے دیپ جل رہے تھے۔ معاذ اس منظر سے خوب لطف اندوز ہوا۔

”اللہ کا بہت شکر ہے۔ اس نے دعا سن لی۔“ اس کی آواز خوشی سے لرز رہی تھی۔

”تمہیں خوشی ہوئی ہے۔“

”ہاں بہت۔“

”لگتا نہیں۔“ وہ حیران ہوئی۔

”لیکن کیوں؟“

”بھئی میں نے خوشی کے اظہار کے لیے تمہارا منہ میٹھا کروایا۔ تمہارا بھی فرض بنتا ہے کہ میرا منہ میٹھا کرواؤ۔“ اس نے مٹھائی کی طرف اشارہ کیا۔

”میں آپ کے لیے کھانا لے کر آتی ہوں۔“ وہ جھینپ کر باہر کی طرف بھاگی اور پیچھے سے معاذ کی آواز آئی

”لوجی اب منہ بھی خود ہی میٹھا کرنا پڑے گا۔ بیگم صاحبہ تو کسی کام کی نہیں ہیں۔“

”خالہ جان کو بھی فون کر کے بتا دیجیے گا۔“ اس نے باورچی خانے سے ہانک لگائی۔

”بتا دیا تھا خالہ کی چچی۔“ وہ مسکرا دیا۔ سامنے ڈائری پر نظر پڑی۔ شرارت سو جھی، ڈائری اٹھائی، پھر سر جھٹک کر اسے مزید ستانے کا ارادہ موقوف کرتے ہوئے وہ کچن کی طرف چل دیا۔

☆.....☆.....☆

فضیل اسے بہت سارے اندیشوں اور وہموں میں گھرا چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ طفل تسلی کے طور پر اسے موبائل فون میں کچھ بیلنس ڈلو کر دے گیا تھا کہ کوئی بھی مسئلہ ہو وہ اسے بتا دے۔ خلاف توقع پہلا ہفتہ اس قدر سکون سے گزرا تھا۔ اس دوران میں فضیل نے دو تین بار کال کر کے اس کا حال پوچھا تھا۔ اسے خود بھی حیرت تھی کہ جتنا وہ ڈر رہی تھی صورتحال اتنی خراب نہیں تھی۔ ویسے بھی جس دن سے اس نے عذرا جہاں کا ہاتھ جھٹکا تھا اس دن کے بعد سے اب تک وہ اسے نظر انداز کر رہی تھیں۔ وہ بھی اس جگہ کم ہی جاتی جہاں ان کے پائے جانے کے امکانات ہوتے تھے۔ کچھ ایکشن کی مصروفیات کی وجہ سے بھی عذرا جہاں کا زیادہ وقت گھر سے باہر

گزرتا تھا۔ عذرا جہاں کے علاوہ اسے اس گھر میں صوفیہ سے خوف محسوس ہوتا تھا۔ اس کی نگاہیں اسے اپنے وجود کے آر پار جاتی محسوس ہوتی تھیں اگرچہ صوفیہ نے اسے کبھی کچھ نہیں کہا تھا لیکن اس کی چھتی نظروں کو وہ اکثر محسوس کرتی تھی۔ شبانہ اس گھر کا انتہائی غیر جانبدار فرد تھی۔ اسے اس کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس کا کمر اوپر والے پورشن میں تھا اس لیے اپنا کام مکمل کرتے ہی وہ اوپر چلی جاتی۔ صوفیہ کا معاملہ دوسرا تھا اسے ہر ایک کی ٹوہ میں رہنے کی عادت تھی۔ اگرچہ اس کا کمر ابھی اوپر تھا لیکن وہ اپنے بیٹے کے ساتھ زیادہ تر نیچے ہی پائی جاتی تھی۔ مرد حضرات کا گھر میں کوئی خاص عمل دخل نہ تھا۔ وہ دن ڈھلے آتے، ماں کے دربار میں حاضری دینے کے بعد اپنے اپنے کمروں میں مقید ہو جاتے۔ البتہ شبانہ کے میاں دلاور نے فضیل کے جانے کے بعد ایک بار اس سے ہمدردانہ گفتگو کی تھی اور اسے کہا تھا کہ کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو وہ اسے بتادے۔ اس نے اثبات میں سر ہلادیا تھا لیکن بعد کی لائق سے ظاہر ہوتا تھا کہ عذرا جہاں نے اس ہمدردی کو خاطر خواہ پسند نہیں کیا۔ ویسے بھی اسے کچھ نہیں چاہیے تھا۔ سارے دن میں دو وقت کا کھانا اور دو جوڑے کپڑوں کے، اس سے زیادہ کی اسے حاجت ہی نہیں تھی۔ امینہ سے اس کی بات چیت ہو جاتی تھی وہ بھی شاید اس لیے کہ وہ اسی کے کمرے میں رہ رہی تھی۔ امینہ دھیمے مزاج اور نرم دل کی مالک تھی۔ اس سے بات کرتے ہوئے اسے کبھی خوف محسوس نہیں ہوتا تھا۔ آغاز میں امینہ نے اس کے بارے میں پوچھنے کی کوشش کی لیکن اس کے گریز کو پا کر دوبارہ نہیں پوچھا۔ رات کچھ بے چینی میں بسر ہوئی اور آنے والی صبح اس کے لیے نئی مصیبت لے کر نازل ہوئی:

”اے لڑکی! ادھر آ جلدی۔“ وہ کچن سے نکل رہی تھی کہ عذرا جہاں کی کرخت آواز نے اسے لرزادیا۔ وہ لٹے پاؤں ان کے کمرے کی طرف بڑھی۔

”یوں دیدے پھاڑ پھاڑ کر میری طرف کیا دیکھ رہی ہے۔ کھا جائے گی مجھے کیا؟“ وہ کمرے میں پہنچ کر خاموش کھڑی ان کے اگلے حکم کی منتظر تھی کہ ایک اور دھاڑ سنائی دی۔

”جج... جی... نہیں تو۔“

”اچھا وہ فضیل نے تجھے جو موبائل فون دیا تھا مجھے لا کر دے۔“ اس نے پوچھنا چاہا کیوں لیکن مصلحتاً خاموشی میں عافیت سمجھتے ہوئے اس نے چپ چاپ ان کے حکم کی تعمیل کی۔ موبائل ان کے ہاتھ میں تھا کہ وہ سوچ رہی

تھی کہ اب کیا کیا جائے۔

”کھڑی کھڑی میرا منہ کیا دیکھ رہی ہے اب.... جادو خان ہو.... اور کوئی کام نہیں ہے تجھے۔“

وہ باہر آگئی۔ باہر آ کر اسے خیال آیا کہ اسے فون ان کو پکڑانے سے پہلے فیصل کو میسج کر کے بتا دینا چاہیے تھا لیکن اتنی حاضر دماغ نہیں تھی وہ۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے گہری سانس لی اور دوبارہ باورچی خانے کی طرف چل دی۔



وہ دن بھی اتنا ہی ہولناک تھا جتنی وہ رات تھی جب دادی کا انتقال ہوا تھا۔ گرمیوں کی وہ دوپہر مجھے آج بھی یاد ہے جب بڑے چچا اور چچی کے ایکسیڈنٹ کی خبر آئی تھی۔ ابو جان اور چھوٹے چچا کے ساتھ بڑے بھائی جان بھی گئے تھے۔ کسی بچے کو بچاتے ہوئے ان کی موٹر سائیکل کا توازن بگڑ گیا اور تیز رفتار بس سے جا ٹکرائے۔ کئی دن یہی سننے میں آیا کہ وہ ٹھیک ہو رہے ہیں لیکن کچھ ٹھیک نہیں ہوا۔ وہ دونوں دنیا چھوڑ کر چلے گئے اور میں سوچ میں پڑ گئی کہ کیا یہ اس وجہ سے تھا کہ انھوں نے پیر صاحب کی بیعت سے انکار کیا تھا یا ان کی شان میں گستاخی کی تھی۔ کیا واقعی اللہ پیر صاحب کی اتنی سنتا ہے؟ اور اگر سنتا ہے تو وہ کسی کو ایسے بددعائیں کیوں دیتے ہیں؟ اس طرح کسی کی زندگی چھین لینے کا ان کو کیا حق ہے؟ مجھے سب سے زیادہ مانی پر ترس آیا۔ مانی بڑے چچا کا اکلوتا بیٹا تھا۔ مجھے یاد ہے وہ کتنا رویا تھا۔ بہت عرصہ گزرنے کے بعد بھی وہ گم صم سا بیٹھا رہتا، خوفزدہ رہتا۔ اس نے سکول جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ چچا چچی اس کا کتنا خیال رکھا کرتے تھے۔ ہم سب میں سب سے زیادہ اچھے کپڑے اور اچھی چیزیں اسی کے پاس ہوا کرتی تھیں۔ جب ہم سب اکٹھے سکول جاتے تھے تب بھی اسی کا یونیفارم سب سے صاف ستھرا ہوتا تھا۔ پھر جب ہم نے مدر سے جانا شروع کیا تب بھی وہ ویسا ہی اجلا اور صاف یونیفارم پہنا کرتا تھا لیکن اب کئی دن تک وہ میلے کپڑوں میں گھومتا رہتا۔ امی یا چھوٹی چچی اس کو صاف کپڑے نکال دیتیں تو پہن لیتا ورنہ یوں ہی میلا سا رہتا۔ زیادہ وقت اپنے پورشن میں گزارا کرتا۔ پہلے پہل اس کو کھانے کے اوقات میں باقاعدگی سے یاد کیا جاتا۔ رفتہ رفتہ سب نے اس کی پروا کرنا چھوڑ دی۔ یہ بھی خیال نہ کیا کہ وہ دس سال کا چھوٹا بچہ ہے۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں اس سے بات کیا کروں جیسے کچھ سال پہلے کیا کرتی

تھی لیکن ابو جان اور بھائیوں نے منع کیا کیونکہ وہ مجھ سے تین سال بڑا تھا اور نامحرم تھا۔ اس نے سکول جانا چھوڑ دیا تھا۔ کسی نے اسے کہا بھی نہیں کہ اسے سکول جانا چاہیے۔ گھر کے چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے اسے آواز دی جاتی۔ وہ جیسے ہر بات سے بیزار ہونے لگا تھا۔ ایک دو بار کسی غلطی پر اسے ابو اور چچا سے تھپڑ کھانا پڑا اور پھر جیسے یہ معمول ہوتا جا رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا گھر میں اس کا کوئی بھی ہمدرد نہیں ہے اور پھر ایک دن وہ بھی چلا گیا۔ اس کے خالہ خالو اسے لے گئے اور بڑے چچا چچی کا قصہ سب نے فراموش کر دیا۔ کتنی عجیب زندگی ہے۔ لوگ نظروں سے دور ہو جائیں تو دل سے بھی دور ہو جاتے ہیں۔ اتنا وقت ساتھ گزارنے والوں کو اتنی جلدی بھلا دینا کتنا آسان ہوتا ہے لوگوں کے لیے، لیکن سب کے لیے نہیں اور شاید میں بھی انھی میں سے ہوں جو سب کچھ جلدی نہیں بھلا سکتے۔ بڑے چچا اور چچی مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔ ابو جان سے بول چال بند ہونے کے باوجود چچی جان ہر سال کی طرح عید پر مجھے اپنے ہاتھ سے کڑھائی کر کے کپڑے دیا کرتیں اور چوڑیاں بھی میچنگ ہوا کرتی تھیں۔ میں ہمیشہ عید کے پہلے دن انھی کے دیے کپڑے پہنا کرتی۔ چچا جان مٹھائی لاتے تو میرا حصہ ضرور بھجواتے۔ انھیں پتا تھا کہ مجھے گلاب جامن کتنے پسند ہیں۔ کل جب معاذ نے مجھے گلاب جامن کھلایا تو بے اختیار مجھے چچا جان یاد آ گئے، وہ گھر، سب لوگ اور نہ جانے کیا کیا کچھ۔ ہاں یقیناً میں بھی انھی لوگوں میں سے ہوں جو سب کچھ جلدی نہیں بھلا پاتے یا کبھی نہیں بھلا پاتے۔

اتنے لوگوں کے کھوجانے کے بعد زندگی بے رونق سی ہو گئی تھی۔ یوں جیسے رک گئی ہو، ٹھہر گئی ہو اور یہ رکی اور ٹھہری ہوئی زندگی متحرک اس وقت ہوئی جب زہرا سے میری ملاقات ہوئی۔ میں اس وقت بارہ سال کی تھی اور وہ بھی لگ بھگ میری ہم عمر تھی لیکن مجھ سے بہت الگ۔ اس کی باتیں مجھے اس قدر متاثر کرنے لگیں کہ میں غیر محسوس طریقے سے اس کی باتوں کی اسیر ہوتی چلی جا رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

شام کے سائے ڈھل رہے تھے۔ سردی سے بچنے کے لیے انھوں نے سوکھی لکڑیاں اور گھاس پھوس ایک جگہ اکٹھی کر کے آگ جلا رکھی تھی۔ گرم چادروں میں خود کو چھپائے وہ پانچوں باری باری حقے کے کش لیتے اور دھیمی آواز میں باتیں کرنے لگتے۔



”چاچا آج چار دن ہو گئے ہیں کرم دین کو قید ہوئے کیا ہوگا اس کا؟“ پہلا بولا۔

”کیا پتا... رب سوہنا جانے یا مالکوں کو پتا ہوگا۔“ بوڑھا کریم بخش گہری سانس لے کر بولا۔

”ویسے تجھے نہیں لگتا چاچا... مالکوں نے بڑی زیادتی کی ہے بے چارے کے ساتھ۔“ دوسرا گویا ہوا۔

”شش... چپ کر... کملا ہوا ہے کیا.... تجھے نہیں پتا پیر صاحب کے موکلوں کا... سب خبر دیتے ہیں اس

کو.... ایسا نہ ہو کہیں تجھے بھی وہیں بند کر دیا جائے۔“ تیسرا رازدارانہ انداز میں بولا۔

”ہوں... کہاں کے موکل... سب بکواس ہے۔“ بوڑھا کریم بخش برا سا منہ بنا کر بولا۔ سب نے حیران

نظروں سے اس کی طرف دیکھا جیسے اس کی ذہنی حالت پر شبہ ہو۔

”کیا مطلب چاچا.... پیر صاحب کے پاس موکل نہیں ہیں؟“ شیدے سے برداشت نہ ہوا اور

بول اٹھا۔

”کچھ نہیں ہے پیر صاحب کے پاس.... کچھ بھی نہیں۔“ بوڑھا اسی انداز میں بولا۔

”چاچا تیری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں... کیا بول رہا ہے تجھے پتا بھی ہے؟“ تیسرے نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

”ہاں پتا ہے... اور بہت اچھی طرح پتا ہے۔“

”کیا بات کرتا ہے چاچا... یہ روحانی سلسلہ تو صدیوں پرانا ہے... بارہویں کہ تیرہویں نسل....“ شیدے

نے انگلیوں پہ گن کر کہا اور چاچا نے بات کاٹ دی۔

”آہو پتا ہے مجھے.... کتنوں نسل ہے... جن کے نام اور نسل پر اترتے پھرتے ہیں ناں یہ سب سلامت

رہیں وہ اللہ والے.... نور پھیلا رہے ہوں گے کہیں اور یہاں یہ رہ گئے گمراہی پھیلانے والے... ہوں۔“

بوڑھے کریم بخش کی نظریں سوکھی لکڑی کو کوئلہ بناتی آگ کی لپٹوں پر ٹھہر گئی اور وہ چاروں کبھی ایک دوسرے کو

دیکھتے اور کبھی اس بوڑھے کو دیکھتے جس کی دماغی حالت بگڑنے کا انھیں یقین ہو چلا تھا۔

”وہ لوگ سونا تھے... عبادت کی مشقت سہتے تھے... سچے عشق کی آگ میں جلتے تھے اور کندن بن کر نکلتے

تھے، پارس تھے وہ لوگ جس کو ہاتھ لگاتے سونا بنا دیتے..... ایک یہ لوگ ہیں سوکھی لکڑی جیسے... دکھاوے کی

عبادتیں کرنے والے... نجانے کس آگ میں جل رہے ہیں کہ کوئلہ بن کر نکلتے ہیں اور جوان کے پاس بیٹھتا ہے

کوئلہ بن جاتا ہے....تن بھی سیاہ، من بھی سیاہ.....۔“ کریم بخش پتا نہیں کس رو میں بولتا چلا جا رہا تھا۔ وہ چاروں گنگ اسے دیکھتے رہے۔ جیسے کچھ بولنا نہ جانتے ہوں۔ وہ جانتے تھے کہ کریم بخش اس حویلی کا بہت پرانا ملازم ہے، بہت سے راز جانتا ہے۔ اس کے باپ اور دادا اسی حویلی میں مالکوں کی خدمت کیا کرتے تھے کریم بخش کی ماں بڑی مالکن کی خاص خادمہ تھی اور کریم بخش کی بیوی بھی مرنے سے پہلے اسی حویلی میں کام کیا کرتی تھی لیکن اس نے اپنی اکلوتی بیٹی کو حویلی میں کام کرنے کی اجازت نہ دی تھی۔ کسی نے وجہ پوچھی تو اس نے یہ کہا کہ اب حویلی میں حالات پہلے جیسے نہیں رہے۔ شیدے سے صبر نہ ہوا اور بول اٹھا:

”کیا کہتے ہو چاچا کیا یہ وہ لوگ نہیں ہیں جن کے بزرگ بغداد سے آکر یہاں آباد ہوئے... جنہوں نے سات ملکوں کی خاک چھان کر یہ رتبہ پایا تھا اور جو کچھ ان کے بارے میں لوگ کہتے ہیں وہ سب.....۔“ کریم بخش نے اس کی بات کاٹ دی۔

”وہ سب سچ تھا..... لیکن یہ سب جھوٹ ہے جو تم کو دکھائی دیتا ہے۔“

”کب سے جھوٹ ہے چاچا.... پیر ذکاء اللہ جھوٹ ہے، پیر کرامت اللہ جھوٹ تھے، بڑے پیر صاحب بھی.....۔“

”نہیں بڑے پیر صاحب جھوٹے نہیں تھے.... وہ سچے تھے... اسی وقت تک سب سچ تھا... انہوں نے کرامت اللہ کو گدی نہیں سوئی تھی... عبداللہ کو اس کا اہل قرار دیا تھا لیکن کرامت اللہ نے.....۔“ کریم بخش کو جیسے ہوش آگیا۔ وہ اس کیفیت سے باہر نکل آیا تھا۔

”پیر کرامت اللہ نے کیا کیا تھا چاچا....۔“ ان میں سے ایک نے سوال پوچھا۔

”کچھ نہیں..... کچھ بھی نہیں.... چلو اپنے کاموں کو لگو بہت آرام ہو گیا۔ مالکوں کا کوئی چمچا ادھر نکل آیا تو سب کی شامت آجائے گی۔“ کریم بخش نے بات بدل ڈالی۔

”نہیں چاچا نہیں... اب تجھے پوری بات بتانی پڑے گی۔ یوں آدھی بات کر کے نہ چھوڑ۔“ وہ سب مضطرب تھے تو شیدے نے سب کی زبان بول دی۔ کریم بخش نے پس و پیش سے کام لیا۔

”نہ بابا نہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں کسی نے سن لیا تو ہم سب کی شامت آجائے گی۔“

”قسمیں چا چاہم چاروں میں سے کوئی بھی یہ بات باہر نہیں نکالے گا۔ مجھے تو پہلے سے ہی شک تھا پیر ذکا اللہ پر... لیکن ڈر جاتا تھا کہ کہیں میرا شک غلط ہوا تو خواخوہ گنہگار ہو جاؤں گا۔“ وہ چاروں اصرار کرنے لگے۔

”اوائے اچھا اوائے جوانو! ٹھیک ہے۔ کل بات کریں گے۔ ابھی بہت وقت ہو گیا ہے۔ مالکوں کے چکر لگانے کا وقت ہو گیا ہے۔ اس بے چارے کرم دین پر پھر سے ظلم کریں گے وہ لوگ۔ میں نے سوچ لیا ہے اب یہاں نہیں رہنا میں نے... اور ظلم نہیں دیکھے جاتے مجھ سے... ان بوڑھی آنکھوں نے بہت ظلم دیکھ لیے ہیں۔ بس اپنی دھی کی شادی کے بعد دور چلا جاؤں گا یہاں سے.... بس چلا جاؤں گا۔“ وہ یہ کہتے ہوئے اٹھ بیٹھا اور اس کے پیچھے وہ چاروں بھی اٹھ کر اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔

☆.....☆.....☆

فضیل دو دن سے پریشان تھا۔ وہ جب بھی اسے فون کرتا یا تو نمبر بند ملتا یا پھر مصروف ہوتا۔ سمجھ نہیں آتا تھا کہ کیا معاملہ ہے۔ آخر تک آکر اس نے گھر کے نمبر پر کال کی۔ فون صوفیہ نے اٹھایا تھا۔ فضیل کے پوچھنے پر وہ بولی: ”گھر پر نہیں ہے اس وقت۔“

”کیا مطلب؟ کہاں گئی؟“ فضیل حیران تھا۔

”لو بھلا بتا کر تھوڑا ہی جاتی ہے کہیں... جب دل چاہا نکل گئے۔ تمہارے جانے کے بعد تو اس کے رنگ ڈھنگ ہی بدل گئے ہیں۔“

فضیل کو اس کی بات پر اعتبار نہیں آیا تھا۔ وہ اسے بھی جانتا تھا اور صوفیہ کو بھی۔ اس لیے اس نے زیادہ بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور بس اتنا ہی کہا:

”ٹھیک ہے جب وہ آئے تو اسے کہیے گا کہ اپنا فون آن رکھے مجھے اس سے بات کرنی ہے۔“ اس کے بعد اس نے فون بند کر دیا لیکن اسے دال میں کچھ کالا لگ رہا تھا۔ عجیب پریشانی نے اسے آگھیرا تھا۔ وہ پہلے ہی اسے وہاں اکیلے چھوڑ کر نہیں آنا چاہتا تھا لیکن اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ وہ ہر رخ پر سوچ چکا تھا، ہر کوشش ناکام ہوئی تھی یا کی جا چکی تھی۔ اسے بڑے طریقے سے اس مقام تک پہنچایا گیا تھا لیکن اس کے باوجود اسے موہوم سی امید تھی کہ شاید اس کی ماں کو اس پر ترس آگیا ہو۔ جانے سے پہلے وہ ماں کے پاس گیا تھا اور بہت امید

اور محبت کے ساتھ درخواست کی تھی کہ اس کے واپس آنے تک اس لڑکی کے ساتھ نرمی برتی جائے۔ شاید اس کی التجا اس کی ماں کے دل پر اثر کر گئی ہو۔ اگرچہ عذرا جہاں نے اسے یقین دہانی نہیں کروائی تھی بس اتنا کہا تھا:

”ٹھیک ہے فضیل میں کوشش کروں گی لیکن تجھے پتا ہے جس بات کے لیے میرا دل نہیں مانتا میں زبردستی اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتی... تو نے یہ ٹھیک نہیں کیا فضیل..... بڑا مایوس کیا ہے مجھے۔“

”معاف کر دو اماں.... میں دل کے ہاتھوں مجبور تھا..... آئندہ کبھی آپ کا کوئی حکم نہیں ٹالوں گا.... بہت کماؤں گا.... ڈھیروں دولت آپ کے قدموں میں ڈال دوں گا.... بس میری خاطر اسے قبول کر لیں۔ اپنے بیٹے کے دل کی واحد آرزو سمجھ کر۔“ اسے ماں کے آگے اپنا گڑگڑانا یاد آ رہا تھا لیکن یہ یاد نہیں تھا کہ ماں نے اس کی ان باتوں کا کتنا اثر لیا تھا۔ اس کی گھبراہٹ میں اضافہ ہونے لگا۔ اب سوائے دعاؤں کے کوئی راستہ نہیں تھی۔ بے اختیار اس کی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھیں۔

”الہی! ایک بار صرف ایک بار میری اس سے بات ہو جائے۔ اس کی خیریت کی اطلاع مل جائے۔ اس کی حفاظت فرما میرے مولا! اس پر کوئی آنچ نہ آنے دینا ورنہ میں اپنی ہی نظروں میں گر جاؤں گا۔ یا رب العزت! تو جانتا ہے میری نیت صاف ہے۔ اس پاک نیت کے صدقے اس کو اپنے حفظ و امان میں رکھ میرے مولا! اسی نیت کے صدقے اس کی حفاظت فرما۔ میں جانتا ہوں ہم نے جو راستہ اختیار کیا وہ غلط تھا۔ ہماری خطا معاف فرما دے مولا! اس تقصیر کی سزا اس طرح نہ دے کہ میری ساری زندگی پچھتاؤں کی نذر ہو جائے۔ ہماری یہ خطا بخش دے مولا! بخش دے۔“ یہ الفاظ اس کے لبوں پہ تھے کہ اذان کی آواز آئی اور اس کے قدم مسجد کی طرف بڑھ گئے۔

☆.....☆.....☆

شام کے سائے بڑھتے گئے اور اندر باہر تاریکی کا راج ہو گیا تو کرم دین پر ایک بار پھر ظلم توڑا گیا۔ زخموں سے نڈھال وہ پھر سے دو بوند پانی کے لیے ترس رہا تھا اور باہر بوڑھا کریم بخش مالکوں کو یقین دلا رہا تھا کہ اس کو کھانے پینے کے لیے کچھ نہیں دیا گیا۔

”نہیں سرکار! میں یہیں ساری رات آنکھوں میں کاٹ دیتا ہوں۔ صبح دو گھڑی کو گھر جا کر آرام کرتا ہوں“

تب بھی یہاں راجا اور شیدا پہرے داری کے لیے ہوتے ہیں کسی نے اسے پانی کی ایک بوند تک نہیں دی۔“  
 ”یہ کیسے ہو سکتا ہے... اتنی جان کیسے ہے اس کے اندر پھر.... تو جب گھر جاتا ہے تو چابی کس کے پاس ہوتی ہے۔“ شیر دل نے سوال کیا۔

”میرے پاس ہی ہوتی ہے چھوٹے سرکار.... بھلا میں یہ لا پرواہی کیسے کر سکتا ہوں۔“  
 ”کج دی اے بڑا گلڑا اے منڈا۔“ غلام نبی بولا۔ ”سن اوئے کریم بخشا! ایس نوں تھوڑا سارا کھانا تے  
 تھوڑا سارا پانی پین نوں دے دیویں اج رات.... کیجے مرمرانہ جاوے کج دسیوں بغیر.... تے سن بوہتا نہیں  
 ...تھوڑا سارا۔“

”جی مالک.... بہت بہتر۔“ سب کے جانے کے بعد کریم بخش کھانا لے کر اندر گیا۔ اس نے مندی مندی  
 آنکھیں کھول کر دیکھا اور بولا:

”چچ... چچ.... چا چا!“

”ہاں پتر بول!“

”چا چا.... زہر لا دے.... میں تھک گیا ہوں.... (کراہتا ہے).... نہیں سہا جاتا یہ درد.... اتنی مار مارتے  
 ہیں۔“

”اللہ غارت کرے ان ظالموں کو... اور اس زہر کو بھی جس نے تجھے یہاں پھنسا یا ہے۔“

”نہ چا چانہ... بی بی کو بددعا نہ دے۔“

”کیوں نہ دوں.... اتنا سب کچھ ہو جانے کے بعد بھی تو اس کی خیر چاہتا ہے۔“ کریم بخش ساتھ ہی  
 ساتھ اسے کھانا بھی کھلا رہا تھا۔

”پتا نہیں چا چا میں کیا چاہتا ہوں۔“ روٹی کا آخری نوالہ ختم کرنے تک اس کے وجود میں اتنی سکت آچکی تھی  
 کہ وہ روانی سے اپنی بات مکمل کرنے کے قابل ہو گیا تھا۔ کریم بخش نے اسے حکیم صاحب کی دوا دی۔ دوا سے  
 اس کا درد کم ہو جاتا تھا لیکن پھر بھی تکلیف تو تکلیف ہوتی ہے آخر کب تک سہا جائے۔ آج چار دن ہو گئے تھے وہ  
 تنگ آچکا تھا ایک ہی کرسی پر بندھے ہوئے۔ ایک ہی انداز میں بیٹھے ہوئے اسے لگتا تھا کہ وہ کبھی کھڑا نہیں

ہو پائے گا۔ کریم بخش کی وجہ سے اس کے ہاتھوں اور پیروں پر بندھی رسی تھوڑی ڈھیلی ہوئی تھی تو قدرے سکون تھا۔

”چاچا! کچھ دیر کھول دے یہ رسیاں میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو جاؤں ذرا کی ذرا لیٹ جاؤں۔ کمر دکھ رہی ہے۔“

”ارے ہاں یہ خیال مجھے کیوں نہیں آیا۔ میں رات بھر کے لیے تیری رسیاں کھول دیتا ہوں تھوڑا آرام ملے گا تجھے۔ صبح ہونے سے پہلے باندھ دوں گا اسی طرح۔“ پھر کوئی خیال آیا اور رسیاں کھولتے ہوئے اس کے ہاتھ رک سے گئے، ”تو مجھے دعا تو نہیں دے گا ناں۔“

”دعا دینا ہوتا تو لوٹ کر کیوں آتا چاچا!..... اور تجھ سے دعا کر کے مجھے گنہگار نہیں ہونا..... میری چلتی سانس تیری احسان مند ہیں۔ میرا رواں رواں تیرا قرض دار ہے۔“

کریم بخش نے اس کی رسیاں کھول دیں اور باہر سے دروازہ مقفل کر دیا۔ کرم دین لڑکھڑاتے پیروں سے کھڑا ہوا اور گرتے گرتے سنبھلا۔ پیراس کے وجود کا وزن اٹھانے سے انکاری تھے۔ وہ وہیں ٹھنڈی زمین پر لیٹ گیا۔ ٹھنڈک کے باوجود ایک طمانیت بھرا احساس اس کے اندر اتر کر زمین کے ساتھ لگی تو عجیب سے سکھ کا احساس ہوا۔ دھیرے دھیرے ٹانگیں کھولیں تو درد کی لہر اپنی جگہ لیکن جو اطمینان اسے نصیب ہوا اس کے لیے اس نے چاچا کریم بخش کو دعائیں دیں۔ وہ کتنی ہی دیر یونہی ٹھنڈی زمین پر لیٹا رہا۔ ہاتھ پاؤں سیدھے، پھر کروٹ بدلی، سامنے کھڑکی کے پٹ ملتے ہوئے محسوس ہوئے۔ ایک خوش کن خیال اسے سرشار کر گیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا اٹھا، کھڑکی پر ایک ہاتھ مارا تو وہ کھلتی چلی گئی کیونکہ اس کی چٹنی زنگ آلود ہو کر اس قدر کمزور ہو چکی تھی کہ اس کا کمزور سا ہاتھ لگنے پر باہر جا گری اور کھڑکی کھلتی چلی گئی۔ اس کا دل زور سے دھڑکا ایک فاسد خیال نے اسے ستایا اور وہ ایک جست میں کھڑکی سے باہر کود گیا۔

☆.....☆.....☆

زہرا اگرچہ میرے جتنی خوبصورت نہیں تھی لیکن خاصی پرکشش تھی۔ شوخی اس کے ہر انداز سے ٹپکی پڑتی تھی۔ اگرچہ اس کے گھر کا ماحول بھی میرے گھر کے ماحول سے زیادہ مختلف نہ تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اس



کے گھر کا ماحول ہی ہمارے گھر کے ماحول پر اثر انداز ہوا تھا کیونکہ وہ پیر ذکاء اللہ کی بیٹی تھی۔ پیر ذکاء اللہ کی تیسری اور چیمپی بیوی کے لطن سے پیدا ہونے والی بیٹی، اس لیے بیٹی ہونے کے باوجود قدرے عزیز تھی لیکن میرے خیال سے یہ بات زہرا نے خود اخذ کر رکھی تھی کہ وہ پیر ذکاء اللہ کی لاڈلی بیٹی ہے کیونکہ مجھے تو ایسے کوئی آثار دکھائی نہیں دیے تھے۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ وہ خود دوسروں کے سر پر سوار ہونے والی خصوصیات کی حامل تھی اس لیے دوسرے اس کی بات مانے بنا کوئی راہ نہ پاتے تھے۔ وہ بلا کی خود پسند ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی حسن پرست بھی تھی۔ یہی چیز اسے میرے قریب لے آئی۔ میری خوبصورتی نے اسے متاثر کیا اور اس نے مجھے اپنی دوستی کے قابل سمجھا۔ ہمیشہ کی طرح محفل میں نعتیں پڑھی جارہی تھیں اور اس کے بعد پیر صاحب کا درس شروع ہو جاتا۔ نعتوں تک محفل میرے لیے قابل قبول تھی لیکن پتا نہیں جب بھی پیر صاحب کا درس شروع ہوتا تو میرا دل گھبرانے لگتا۔ مجھے ان کی باتوں میں کوئی دلچسپی محسوس نہ ہوتی بلکہ ایسی خوفزدہ کر دینے والی باتیں سن کر میرا دل اللہ سے دور ہونے لگتا تھا۔ درس کا آغاز ہوا تو ایک عورت نے آکرامی کے کان میں کچھ کہا اور امی نے مجھے دھیرے سے کہا، ”جا اس عورت کے ساتھ اندر چلی جا تجھے پیر صاحب کی بیٹی بلواری ہی ہے۔“ میں حیران ہوئی اور امی کے اصرار پر اندر چلی گئی۔ یہ میری زہرا سے پہلی ملاقات تھی۔

جب میں اندر گئی تو زہرا نمک اور کالی مرچ لگا کر امرود اور کیٹو کھانے میں مصروف تھی۔ مصروف سے انداز میں اس نے مجھے اندر آنے کا اور اپنے قریب کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اشارے سے پوچھا کہ میں کون ہوں کیونکہ اس کے منہ میں امرود کی بڑی سی پھانک تھی اس نے انگلی پر نمک لگا کر چاٹا زور سے چٹکارہ بھرا اور بولی، ”اوئے ہیلو! گوگلی ہے کیا؟“ اور میں ہوش کی دنیا میں واپس آئی کیونکہ میں اس کی مصروفیت دیکھنے میں اس قدر مگن تھی کہ اتنی دیر میں کچھ بھی نہ کہہ پائی تھی۔

”ارے نہیں.... میں بول سکتی ہوں۔“ میں نے بے ساختہ کہا۔

”چل شکر ہے... ہاں تو میرا نام زہرا ہے۔ پیر ذکاء اللہ کی سب سے چیمپی بیٹی ہوں.... اوہو یہ کہا زیادہ مناسب ہے کہ اکلوتی چیمپی بیٹی ہوں... اس لیے کہ میرے بابا کی پہلی نمبر والی بیوی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی، دوسری والی سے ایک ہی بیٹا ہے، شیردل بھاجی... اور تیسری اور سب سے لاڈلی بیوی سے صرف ایک ہی بیٹی ہوں

آہو۔“ وہ نان اسٹاپ شروع ہو چکی تھی اور اس دوران میں اپنے مشغلے میں بھی ہنوز مصروف تھی۔ پھر اسے کچھ خیال آیا اس نے صاف پلیٹ اور نمک دانی میری طرف بڑھائی:

”یہ لے کھا۔“

”نہیں... مجھے نہیں چاہیے۔“ میں نے اپنی عادت کے مطابق تکلف سے کام لیا اس لیے کہ نہ میری کوئی سہیلی تھی اور نہ ہی کہیں آنا جانا تھا اس لیے ایک خاموش سی اداسی اور تکلف میری شخصیت کا حصہ بن چکے تھے۔ گھر میں میری ہم عمر کوئی لڑکی نہ تھی بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ کوئی بھی لڑکی نہ تھی اس لیے پورے دن کا زیادہ تر حصہ میں خاموش رہ کر گزارتی تھی۔ حسب ضرورت امی مجھ سے اور میں امی سے بات کرتی تھی، کبھی کبھار چھوٹی چچی سے بات ہو جاتی ورنہ تمام دن مدرسے کا سبق یاد کرنا یا پھر روبروٹ کی طرح گھر کے کام کرتے رہنا میرا معمول تھا۔ زہرا جیسی زندہ دل لڑکی سے مل کر مجھے اچھا لگا تھا۔ اس نے میرے تکلف کو کوئی خاص اہمیت نہ دی اور دو کچے امرود، چھری اور دو کینو میری پلیٹ میں رکھ دیے۔

”اے کھا بھی لے نخرے نہ کر... یہ امرود اور کینو ہمارے اپنے باغ کے ہیں۔ امرود کچے ہیں لیکن بے حد میٹھے۔ ذرا نمک اور مرچ لگا کر کھا مزانہ آیا تو پھر کہنا۔“ میں حیرت سے اسے دیکھنے میں مصروف تھی۔ میں غور کر رہی تھی کہ صرف اس کی زبان نہیں بولتی تھی بلکہ اس کا ہر عضو بات کرتا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی مخروطی انگلیاں، اس کی سیاہ موٹی موٹی آنکھیں، اس کے ابرو سب کے سب بولتے تھے اس کے ساتھ... اسے دیکھنا مجھے عجیب سی خوشی اور مسرت کا احساس دلا رہا تھا۔ میں نے امرود کھانا شروع کیا۔ وہ واقعی میٹھا تھا یا شاید زہرا کی چرب زبانی نے اس میں زیادہ مٹھاس بھردی تھی۔ لیکن کچھ بھی تھا زہرا کی باتیں امرود اور کینو سے زیادہ کھٹی میٹھی تھیں۔ مجھے یاد ہے اس دن میں بار بار اتنا مسکرائی تھی کہ میرے جڑے دکھنے لگے تھے۔ مجھے واقعی اتنا مسکرانے کی عادت نہیں تھی۔ کچھ بھی تھا یہ احساس میرے اندر کی لڑکی کو جگا رہا تھا، میرے اندر ترنگ اور نزاکت پیدا کر رہا تھا۔

”نام کیا ہے تیرا؟“ جب وہ مجھ سے ڈھیروں ادھر ادھر کی باتیں کر چکی تو اسے میرا نام پوچھنے کا خیال آیا۔

”فجر... فجر ار مغان۔“ اس نے عجیب سا منہ بنایا۔

”یہ کیسا نام ہے... فجر ظہر عصر مغرب عیثا۔“ اور اپنے اس مذاق پر وہ خود ہی زور سے ہنس دی۔ مجھے اس کی

کوئی بھی بات بری نہ لگتی تھی میں پھر سے مسکرا دی۔

”اچھا چل جیسا بھی نام ہے ٹھیک ہے مجھے کیا.... بات یہ ہے کہ تو ہے بڑی پیاری۔“ اس نے میرے گال چھوتے ہوئے کہا۔

”بس آج سے تو میری سہیلی ہے.... پکی والی۔“ میں نے سعادت مندی سے سر ہلا دیا۔ پھر خوب ساری باتیں کر کے جب میری امی نے مجھے واپسی کا پیغام بھجوایا تو میں اس سے رخصت لے کر چل دی اس نے مجھے میرے پیچھے سے آواز دی۔

”اے فجر ظہر.... (بولتے بولتے اس نے دانتوں تلے اپنی زبان دی) اپنا موبائل نمبر دے کر جا۔ میں تجھے مزے مزے کے میج سینڈ کروں گی۔“

”اچھا میں ابوجان سے پوچھ کر بتاتی ہوں۔“

”اے بدھو کس کا نمبر بتاتی ہو مجھے اپنے ابوجان سے پوچھ کر۔“ اس نے نظریں اپنے موبائل سے ہٹا کر کہا۔

”ابوجان کا.... اور کس کا۔“ اس نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔

”اے پاگل اپنا نمبر دے مجھے۔“

”میرا....“ میں حیران ہوئی لیکن میرے پاس تو موبائل نہیں ہے۔

”ہائیں.....“ اس نے مجھے یوں دیکھا جیسے کسی اور دنیا کی مخلوق کو دیکھ لیا ہو۔

”کیوں؟“

”میں نے کرنا بھی کیا... کسی کو فون کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ کبھی کسی رشتے دار کا فون آتا ہے تو گھر کے

نمبر پر ہی بات ہو جاتی ہے یا ابوجان کے موبائل پر۔“

”تو اپنی سہیلیوں کے ساتھ کیسے بات کرتی ہے۔“

”سہیلیاں... میری تو کوئی سہیلی نہیں ہے۔“ اسے حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔ اس نے میرے سامنے

ہندوؤں کی طرح ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا (یہ میں نے چھپ چھپ کرٹی وی میں دیکھا تھا کہ اس طرح ہندو پرنام

کرتے ہیں)

”ٹھیک ہے ستی ساوتری... آپ جائیں اگلی بار آئیں گی تو آپ سے بات ہوگی۔“ میں مسکرا دی اور اسی طرح مسکراتے ہوئے امی ابو کے پاس گئی۔ وہاں پہنچ کر اپنے چہرے کے زاویوں کو پہلے والی حالت میں لانے کے لیے مجھے خاصی محنت کرنی پڑی کیونکہ مجھے بار بار زہرا کی باتیں مسکرانے پر مجبور کر رہی تھیں۔

☆.....☆.....☆

”اے لڑکی فضیل کا فون آنے والا ہے۔ ادھر بیٹھ کر کال سننا اور خبردار اس سے کچھ کہایا پھر اس سے کوئی ایسی ویسی بات کی جس سے اس کو ظاہر ہو کہ اس کی کال کوئی اور بھی سن رہا ہے یا یہاں تیرے علاوہ کوئی اور بھی موجود ہے۔“ عذرا جہاں نے اسے حکم سنایا اور وہ وہیں ان کے کمرے میں بیٹھ گئی۔ حسب معمول صوفیہ اپنی طٹریہ نظروں کے ساتھ وہیں موجود تھی۔ فون کی گھنٹی بجی۔ عذرا جہاں نے اسپیکر آن کر کے اسے فون تھما دیا۔ اس نے ایک نظر ان کو اور فون کو دیکھا اور بغیر کوئی تاثر دیے وہیں بیٹھی رہی۔

”ہیلو۔“ فضیل کی آواز اسے سنائی دی لیکن وہ چپ رہی۔ دوسری اور تیسری بار ہیلو بولا گیا اب کی بار عذرا جہاں نے اس کا کندھا ہلایا انھوں نے اسے خونخوار نظروں سے دیکھا۔ واضح اشارہ تھا کہ وہ بات کرے۔

”ہیلو... کیا ہوا؟ بولتی کیوں نہیں... میری آواز نہیں سنائی دے رہی؟“ فضیل کی فکر مندی آواز سنائی دی۔

”نہیں... آرہی ہے آواز۔“ اس کا لہجہ بے حد سپاٹ تھا کسی بھی جذبے سے عاری۔

”اوہ... شکر ہے... کتنے دنوں بعد تمہاری آواز سنی ہے۔ آج پانچواں دن ہے۔ کہاں تھیں تم اتنے دنوں سے... تمہیں اندازہ بھی ہے میں کتنا فکر مند تھا۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ جن حالات میں تمہیں چھوڑ کر آیا ہوں میرے لیے ایک دن بھی بنا تمہاری آواز سنے چین سے رہنا کتنا مشکل ہے... لیکن جب فون کرو یا تو فون بند ہوتا ہے یا بزی... اتنی دیر تک کس سے بات کرتی رہتی ہو؟ فون اتنی دیر بزی کیوں رہتا ہے؟“ فضیل کے شکوے ختم ہونے کو ہی نہیں آرہے تھے۔ وہ چونک اٹھی:

”بزی؟“ اس کی نظریں بے ساختہ عذرا جہاں کی طرف اٹھیں جن کے لبوں پر طٹریہ مسکراہٹ تھی۔

”ہاں... بزی اور وہ بھی لگا تار گھنٹے بھر کے لیے اور اس کے بعد فون آف... اللہ قسم اگر آج بھی تم سے بات نہ ہوتی تو شاید میرا دم ہی نکل جاتا۔“ فضیل کی جذبے سے بھرپور آواز اسے سنائی دی۔

”ایسا نہیں کہتے۔“ وہ بس یہی کہہ پائی۔

”کیوں نہیں کہتے۔ حد ہوتی ہے کسی بات کی۔ تم... تم میری کیفیت نہیں سمجھ پارہیں... میں نے جانے سے پہلے بھی بار بار تاکید کی تھی کہ روز مجھ سے بات ضرور کرنا بھلے ہی ایک منٹ کے لیے... (اس نے گہری سانس لی) یہ پانچ دن... اور ان دنوں کا ایک ایک لمحہ مجھ پر عذاب بن کر گزرا ہے۔ ہر لمحہ لیوں پر صرف تمہارے لیے دعا تھی۔ تم... تمہیں احساس ہے؟ بولتی کیوں نہیں کچھ....“

”ہوں.... ہاں۔“

”کیا ہوں ہاں... اب بھی بات نہیں کرو گی؟ سب ٹھیک ہے ناں؟۔“

”ہاں سب ٹھیک ہے۔“

”کوئی پاس ہے کیا؟۔“ اس نے عذرا جہاں کی طرف دیکھا ان کی نگاہوں میں واضح تنبیہ تھی۔

”نہیں تو۔“

”ناراض ہو؟۔“

”نہیں۔“

”پھر فون کیوں آف رکھا؟ اوئے ہیلوفون تمہارے پاس ہی تھا ناں؟۔“ اسے ایک اور شک ستایا۔ وہ چپ

رہی۔

”ہیلو؟۔“ عذرا جہاں نے اس کے بازو پر چنگلی بھری۔

”آہ.... ہاں۔“ اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا اور آواز بھی بھرا گئی۔

”تم ٹھیک تو ہوناں؟۔“ فضیل بے حد فکر مند تھا۔ ”یار پلیز ٹھیک سے بات کرو... میں پاگل ہو جاؤں گا۔“ وہ

تقریباً چلا اٹھا۔

”میں ٹھیک ہوں... سر میں بہت درد ہے.... اور میں بہت تھک گئی ہوں۔“ اس کا ضبط جواب دے گیا۔ وہ

پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ فضیل اسے روتے ہوئے سنتا رہا اور پھر بولا:

”بس..... میری جان... بس اب اور نہیں...“ وہ اپنے جذبوں کا اظہار کر رہا تھا۔ اس کی ہمت

بندھا رہا تھا لیکن وہ شاید کچھ بھی نہیں سن رہی تھی۔ آنسو سکیوں میں بدلے۔

”یہ مقدر بہت ظالم چیز ہے... اگر کوئی جاندار چیز ہوتی تو اب تک اسے قتل کر چکا ہوتا۔ کاش میرے بس میں ہوتا یہ سب کچھ بدل دینا... کاش... میرا دل کرتا ہے دنیا بھر کی خوشیاں تمہارے قدموں میں رکھ دوں لیکن کتنا مجبور ہوں میں تمہیں اندازہ نہیں ہے... یہاں ایک ایک پل کانٹوں پر بسر ہو رہا ہے۔ مجھے پتا ہے اماں کا سلوک کیسا ہوگا تمہارے ساتھ لیکن کوئی راستہ نہیں تھا کیا کرتا میں۔ (اس کی نظریں پھر عذرا جہاں کی طرف اٹھیں جہاں ماتھے پر سلوٹوں میں اضافہ ہو چکا تھا) یا ر پلیز رومت... تم جانتی ہو کہ تمہارا ایک ایک آنسو میرے دل پر گرتا ہے، بس اب آنسو پونچھ لو... پونچھ لیے۔“

”ہاں۔“

”شاہاش... گڈ گرل۔ اب کبھی مت رونا۔ اس وقت کو آخری آزمائش سمجھ کر گزار لو۔ اس ایک ایک مشکل پل کا سارا حساب میں بہت جلد چکا دوں گا۔ دیکھنا کبھی تمہاری آنکھوں میں ایک آنسو نہیں آنے دوں گا۔ زندگی خوشیوں کی برسات بن جائے گی۔ جنت جیسی آسودگی، چین، اطمینان اور محبتیں... صرف محبتیں... نفرتوں سے بہت دور، ہم گھر بنائیں گے... ایسا گھر جس کے ہر کونے میں دھنک جیسے رنگ ہوں گے۔“ وہ اسے پھر سے جاگتی آنکھوں کے خواب دکھا رہا تھا۔ وہی باتیں جنہیں سن سن کر وہ اب بیزار ہونے لگی تھی۔ اس کی نگاہیں وقفے وقفے سے عذرا جہاں کی طرف اٹھتی تھیں۔ خوفزدہ نگاہیں ان کے پتھر جیسے پاٹ چہرے سے ٹکرائیں اور لہو لہان ہونے لگیں۔ دل خون ہونے لگا لیکن فضیل ان سب باتوں سے بے نیاز اپنی رو میں بولے جا رہا تھا:

”صرف چند مہینوں کی بات ہے... تمہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ جتنی جلدی ہو سکے پیسے اکٹھے کر لوں اس دو چار مہینوں تک جتنے پیسے ملیں گے ان سے شجاع بھائی صاحب کا قرض چکا دوں گا اور پھر چند اور مہینے انتظار کرنا ہوگا۔ میں یہاں سولہ سترہ گھنٹے کام کرتا ہوں، میری پوری کوشش ہے کہ جلدی لوٹ آؤں اور سب سے پہلے ہم نکاح کر لیں گے۔ تم سے اتنی دور آنے کے بعد مجھے یہ پچھتاوانا گ کی طرح ڈستا ہے کہ اس کام میں کوتاہی کیوں کی۔ گھر والوں سے مصلحتاً جھوٹ بول کر کام چلا لیا لیکن....“ وہ نجانے اور کیا کچھ بول رہا تھا لیکن اس کے کان اس قدر سائیں سائیں کرنے لگے کہ کچھ بھی سننا دشوار

ہو گیا تھا۔ عذرا جہاں اور صوفیہ پر جیسے بم پھوٹا تھا۔ اس کا رنگ سفید لٹھے کی طرح سفید تھا۔ یہ بات امینہ کے کانوں نے بھی سنی جو کمرے میں عذرا جہاں کے لیے چائے رکھنے آئی تھی۔ اس کے قدم بھی جیسے وہیں کے وہیں تھم گئے تھے۔ نجانے کب وہ فون بند کر چکا تھا لیکن اس نے ابھی تک کان سے لگایا ہوا تھا۔ عذرا جہاں نے چیل کی طرح جھپٹا مار کر اس سے فون چھین لیا۔ اس کے لیے عذرا جہاں کی نظروں کا سامنا کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ جانے اب اس پر کون سا قہر ڈھایا جائے گا۔



کریم بخش کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی جب شیدے نے آکر بتایا کہ مقفل دروازے کی کھڑکی اس نے کھلی دیکھی ہے۔ وہ دونوں بھاگتے ہوئے مقفل دروازے کے پاس گئے۔ کریم بخش نے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازہ کھولا تو اندر کرم دین کو سوئے ہوئے دیکھ کر اس کی سانس میں سانس آئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر کھلی ہوئی کھڑکی کی طرف دیکھا۔ آہٹ پا کر کرم دین بھی اٹھ بیٹھا:

”چاچا! مالکوں سے کہنا یہ کھڑکی کا کنڈا ٹھیک کروالیں، آپوں آپ ہی کھل گیا تھا۔“ کریم بخش کی آنکھیں نم تھیں اور لب مسکرا رہے تھے۔ اس نے اس انوکھے قیدی کے ہاتھ پاؤں باندھنے شروع کر دیے کہ کہیں مالکوں کو بھنک نہ پڑ جائے۔

”اوئے کرم دینا! تو کس مٹی کا بنا ہوا ہے اوئے.... اتنا اچھا موقع گنوا دیا، تو چاہتا تو بھاگ بھی سکتا تھا۔ کمراتی اونچائی پر نہیں تھا، کھڑکی سے کودنا آسان تھا۔“ شیدا حیران تھا۔

”یہ تو نہیں سمجھے گا شیدے۔“ کرم دین نے خاموشی سے رسیاں بندھواتے ہوئے جواب دیا۔ شیدے نے استفہامیہ نظروں سے چاچا کریم بخش کو دیکھا۔ وہ اب بھی مسکرا رہا تھا اور آنکھوں میں آنی نمی کو صاف کر رہا تھا۔ کریم بخش نے کرم دین کی پیشانی چوم لی۔

”تو ہیرا ہے اوئے... کرم دینا! اللہ تجھے اس مشکل سے نجات دے۔“ شیدے کی آنکھوں میں ڈھیروں سوال تھے لیکن ان کے جواب نہ کرم دین کے پاس تھے اور نہ ہی کریم بخش کے پاس، البتہ اس قفس کی ایک ایک اینٹ اور کھلی کھڑکی پکار پکار کر اس کی ہر بات کا جواب دے رہی تھی:



تو نے اندازا سیری دیکھا ہے اندازِ وفا نہیں  
پنجرہ کھول بھی دو تو کچھ پنچھی جایا نہیں کرتے

کریم بخش نے شیدے کو چلنے کا اشارہ کیا۔

”اس کھڑکی کا کچھ کر لے چاچا! اللہ قسم ایمان ڈالتا ہے۔“ کرم دین نے ایک آنکھ مارتے ہوئے اشارہ کیا۔

”چل بدمعاش۔“ کریم بخش نے دروازہ مقفل کر دیا۔

وہ اکیلا اندر رہ گیا۔ ڈھیلی ڈھالی رسیوں میں بندھا ہوا۔ اس کی نظریں کھلی کھڑکی کی جانب اٹھ گئیں۔ رات وہ کھڑکی سے کود گیا تھا لیکن اگلے ہی لمحے کریم بخش کا مشفق چہرہ نگاہوں میں گھوم گیا اور یہ خیال اسے واپس اسی کمرے میں کھینچ لایا کہ مالک اس بوڑھے کے ساتھ کیسا سلوک کریں گے۔ ہاں یہ تھا کہ ٹھنڈی زمین کے باوجود رات اچھی کٹ گئی تھی۔ فراغت کے لمحات میں یادیں بار بار ذہن کے جھروکوں پر آ کر دستک دیتی ہیں۔ وہ اپنی بائیس سالہ زندگی کے شب و روز کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اپنی زندگی کے انیس سال اس نے اس حویلی میں گزارے تھے۔ وہ تین سال کا بچہ تھا جب اسے یہاں چھوڑا گیا تھا۔ یہ باتیں اسے پرانے ملازموں نے ہی بتائی تھیں۔ اس کے گاؤں میں سیلاب آیا اور یہ پانی کارایلا جہاں سب کچھ بہا کر لے گیا وہیں اس کا خاندان بھی ڈوب مرا۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ اس کے خاندان میں کون کون تھا۔ بس ہوش سنبھالتے ہی اس نے خود کو اس حویلی میں پایا تھا۔ مولوی اللہ دتہ نے اس کی پرورش کی تھی، اپنے بچوں کی طرح پالا، قرآن پڑھایا، واجبی سا پڑھ لکھ بھی گیا تھا۔ پھر اسے حویلی میں ڈرائیوری کا کام سونپ دیا گیا۔

سال بھر پہلے جب زہرا بی بی نے کالج میں داخلہ لیا تو اس کو لانے لے جانے کی ذمہ داری اسے سونپی گئی۔ اتنے سال یہاں گزارنے کے باوجود اس نے حویلی کی عورتوں کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھا تھا خواہ وہ یہاں کی ملازمہ ہی کیوں نہ ہو لیکن زہرا بی بی کی بات اور تھی۔ زہرا بی بی کے کالج کا پہلا دن اس کی نظروں کے سامنے آ گیا۔ زہرا نے ایسی حرکت کی کہ وہ بے اختیار بیک مرر سے پیچھے دیکھنے لگا۔ کالج قریب آیا تو زہرا نے پہلے اپنی نقاب پٹٹی،

پھر برقع اُتار کر ایک طرف رکھا اور گلے میں دوپٹا ڈال لیا، میک اپ درست کیا، کھلے بالوں میں برش پھیرا، انگوٹھیاں اور بریسلٹ پہنے تیار ہو گئی۔ وہ پیر صاحب کے گھر کی عورتوں سے ایسی امید وہ نہیں کر سکتا تھا۔ اسی اثنا میں گاڑی کو جھٹکا لگا کیونکہ وہ اس دوران میں اسپید بریکر دیکھ نہیں پایا تھا۔

”اے دھیان کدھر ہے تمہارا! ٹھیک سے گاڑی چلاؤ ناں۔“ زہرا نے اسے تنبیہ کی۔

”جی... جی۔“ وہ بس اتنا ہی کہ پایا تھا۔ کالج پہنچ کر زہرا نے بیگ اٹھایا اور چل دی لیکن یکدم کچھ یاد آیا اور وہ پلٹی:

”اے سنو! خبردار اگر کسی کو بتایا کہ میں کالج بنا برقعے اور نقاب کے گئی تھی اور یہ برقع کہیں ادھر ادھر نہ ہونے پائے... آئی سمجھ؟“

”جی... جی ہاں... بہت اچھی طرح۔“

”ہوں... اچھی بات ہے کافی سمجھدار لگتے ہو۔“ اتنا کہ کروہ چل دی اور کرم دین حیران پریشان سا اسے کالج گیٹ کے اندر جاتے دیکھتا رہا اور ٹھنڈی آہ بھری۔ یہ کیفیت پہلے دن تھی پھر وہ اس نظارے کا عادی ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

زہرا کی دوستی سے مجھے ایک اور فائدہ ہوا۔ مجھے کالج میں ایڈمیشن کی اجازت مل گئی۔ مجھے امید نہیں تھی کہ مجھے کبھی بھی کالج جانے کی اجازت ملے گی۔ مدرسے کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد میں نے پرائیویٹ میٹرک کا امتحان دیا اور پرائیویٹ طور پر ہی ایف اے کرنے کا ارادہ تھا کہ ایک روز زہرا نے کہا:

”مجھے پرائیویٹ نہیں پڑھنا۔ میں تو کالج جاؤں گی۔“ میں ہکا بکا اس کا منہ تکتے لگی۔

”تم کیسے جاؤ گی کالج؟“

”جیسے تم جاؤ گی۔“ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

”میرے ابو کبھی بھی مجھے کالج جانے کی اجازت نہیں دیں گے۔“

”ہاہا... میں دلواؤں گی اجازت... تم گھبراتی کیوں ہو۔“ اس نے لا پرواہی سے کہا۔

”ناممکن ہے۔“

”زہرا کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں... بس دیکھتی جاؤ۔ یہ سب میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔“ اس نے بائیں ہاتھ سے چٹکی بجائی۔ بس پھر کیا تھا۔ میں خود بھی حیران ہو گئی جب ابو جان میرے رزلٹ کے بعد خود میرے لیے ایڈمیشن فارم لائے۔ میرا دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آتا تھا یہ سب کیسے ہو رہا ہے لیکن سب ہو گیا اور میں بھی زہرا کے ساتھ کالج پہنچ گئی۔ زہرا اپنے ڈرائیور کے ساتھ اپنی گاڑی میں کالج جاتی تھی جبکہ میرے لیے وین لگوائی گئی۔ پردے کی سخت تاکید تھی۔ ابا جان کا حکم تھا کہ میں کالج میں بھی برقعے اور نقاب میں رہوں لیکن کالج میں نقاب والی لڑکیوں کے لیے ہدایت تھی کہ وہ کالج آنے کے بعد کامن روم میں جا کر اپنے عبا یا اور برقعے اتار دیں اور کالج سے نکلتے وقت پہن لیں کیونکہ کالج میں یونیفارم میں رہنا ضروری ہوتا تھا۔

کالج جا کر مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں کسی انوکھے جہان میں آ گئی ہوں جیسے کوئی خلائی مخلوق زمین پر اتر آئے اور حیران پریشان ہر چیز کو دیکھے، لگ بھگ وہی حالت میری بھی تھی میرے مقابلے میں زہرا بہت حد تک خود اعتمادی کے ساتھ کالج آئی بلکہ میں تو اسے دیکھ کر حیران ہی رہ گئی میری وین مجھے پہلے چھوڑ گئی تھی اس لیے میں مین گیٹ کے سامنے والی سیڑھیوں میں بیٹھ کر زہرا کا انتظار کرنے لگی اچانک کسی نے میرے سامنے چٹکی بجائی:

”ہیلو... کن خیالوں میں گم ہو میم؟“

”ارے زہرا یہ تم ہو؟“ میں اسے پہچان ہی نہ پائی۔ اس کے بال کھلے تھے، ہلکا میک اپ، جیولری پہنے وہ کوئی ماڈرن سی لڑکی لگ رہی تھی۔

”چل اٹھ یہاں سے، کامن روم میں چل مجھے کیونکس بھی لگانی ہے۔“ وہ مجھے تقریباً کھینچتی ہوئی اپنے ساتھ لے گئی۔ وہ دن میرے لیے عجیب تھا۔ میں کسی طلسم کدے میں داخل ہو چکی تھی اور ہر لمحہ تحیر کے نئے درجہ پر کھول رہا تھا۔ پورا دن کلاس نہیں ہوئی۔ ٹائم ٹیبل نوٹس بورڈ سے نوٹ کیا اور گھومتے پھرتے کھاتے پیتے وقت گزرا۔ اس دن ہماری کچھ اور سہیلیاں بھی بنیں جو یقیناً خوبصورت تھیں اور خاصی طرح دار بھی... اس لیے کہ زہرا کو ایسی ہی لڑکیاں اچھی لگتی تھیں۔

”یہ تم کیا دوپٹا لپیٹے اماں دادی بنی بیٹھی ہو۔“ زہرا نے مجھے کوئی دسویں بار جتایا اور چاہا کہ میرا دوپٹا اُتر داکر گلے میں ڈلوائے لیکن میں چاہ کر بھی ایسا نہ کر پائی۔ مجھے گلے میں رسی کی طرح دوپٹا لیتے ہوئے عجیب سی حیا محسوس ہوئی کیونکہ عمر کا ایک حصہ دوپٹا میرے سر اور سینے کی زینت بنا رہا تھا اگرچہ میں اپنے گروپ کی لڑکیوں سے متاثر تھی لیکن ان کے رنگ میں ڈھلنا میرے لیے دشوار تھا۔ میں چاہ کر بھی ان جیسی نہیں بن پائی۔ عجیب سی جھجک مانع ہوتی، کوئی طاقت مجھے روکتی اور میں دوپٹا پھر سے سینے اور سر پر پھیلا لیتی۔ مریم نے میرے بال کھولے اور بہت اچھے طریقے سے سیٹ کیے لیکن کچھ دیر کے بعد ہی میں نے بال پھر سے پونی میں جکڑ لیے۔ سب نے میرے لتے لیے لیکن میں نے معذرت کر لی۔ انھیں جیسے بہانہ مل گیا۔ انھوں نے میرا خوب مذاق اڑایا۔ زہرا ان میں سرفہرست تھی۔ میرا دل بوجھل سا ہو گیا۔ خوب رونے کو دل چاہا لیکن مجھے اور مذاق بننا قبول نہ تھا۔ مریم، عائشہ اور ثانیہ سے آج ہی دوستی ہوئی تھی لیکن زہرا تو مجھے اچھی طرح جانتی تھی۔ اس سے میری دوستی کو تین سال ہو گئے تھے۔ اسے پتا تھا کہ میں اپنے گھریلو ماحول کی وجہ سے کس قسم کے کامپلکس کا شکار ہوں۔ اکثر وہ میری دلجوئی بھی کیا کرتی تھی لیکن اس دن زہرا کی طرف سے میرے دل میں ایک گرہ لگ گئی۔ چھٹی ہونے میں آدھا گھنٹا باقی تھی وہ سب دوبارہ کینٹین کی طرف جانے کو تیار تھیں لیکن میں طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے ایک طرف بیٹھ گئی اور کالج کی گہما گہمی دیکھنے لگی۔ کالج میں ہر قسم کی لڑکی تھی۔ ماڈرن، بے تحاشا ماڈرن، سادہ اور بے تحاشا سادہ بھی.... میں انھیں دیکھ دیکھ کر خود سے ان کا مقابلہ کرنے لگی۔ سر پر حجاب اور دوپٹے لیے بہت سی لڑکیاں اعتماد سے چلتی ہوئی نظر آ رہی تھیں لیکن پہلے ہی دن زہرا اور گروپ کی باقی لڑکیوں کی وجہ سے میرا اعتماد چکنا چور ہو گیا۔ پہلے دن کے آغاز سے پہلے مجھے جتنی خوشی تھی وہ کسی نازک کالج کی طرح چکنا چور ہو چکی تھی۔ کالج سے میری دلچسپی یکدم ختم ہو گئی اور آنے والے سبھی دن مجھے مشکل لگنے لگے۔ میں سوچ چکی تھی کہ آج کے بعد کالج نہیں جاؤں گی۔ پرائیویٹ پڑھنا میرے لیے مناسب ہے۔ دو آنسو پلکوں سے لپک کر میری جھولی میں گرے۔ شاید میرے کالج کا پہلا دن ہی آخری بھی ہوتا اگر مجھے اسی روز چھٹی ہونے سے دس منٹ پہلے عالیہ تنویر نہ مل جاتی۔ عالیہ تنویر نے میرے ارادے بدل دیے اور کالج میرے لیے دلچسپی کی چیز بن گیا۔

☆.....☆.....☆

”کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“ ماں کی بات سن کر فضیل کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ ابھی ایک دن پہلے اس سے بات ہوئی تھی۔ اس کا لہجہ فضیل کو کچھ عجیب سا، کچھ روکھا سا لگا تھا جیسے وہ بات نہ کرنا چاہ رہی ہو، یا جیسے بات کرتے ہوئے خوفزدہ ہو۔ فضیل کو پہلا خیال یہی آیا کہ یقیناً کوئی اس کے پاس ہوگا لیکن اس نے کہا تھا کہ وہ اکیلی ہے۔ فضیل نے اس کی دلجوئی کی ہر ممکن کوشش کی۔ وہ اسے بہتر مستقبل کی یقین دہانی کروا رہا تھا لیکن وہ جیسے سب کچھ بے دلی سے سن رہی تھی یا مجبوراً سن رہی تھی۔ پھر اس کی آواز آنا بند ہو گئی۔ فضیل صرف اس کی سانسوں کی آواز سن پاتا تھا۔ آخر تک آکر فضیل نے فون بند کر دیا۔ یہ سب ایک ہی دن پہلے کا قصہ تھا اور ایک دن بعد دنیا بدل گئی بلکہ یہ کہنا بجا ہے کہ فضیل کی دنیا اجڑ گئی۔ وہ ڈیوٹی پر تھا جب گھر سے کال آئی:

”اے فضیل! وہ... وہ بھاگ گئی، دیکھا گئی اپنی اوقات وہ... تیرا گھرا جڑ گیا میرے بچے!“ عذرا جہاں اتنا کہہ کر رونے لگیں اور فضیل کے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔ اسے لگا اس کے سر پر آسمان گرا ہے یا پیروں تلے سے زمین سرک گئی ہے۔

”وہ... وہ... کہاں جا سکتی ہے ماں، نہیں... وہ کہیں نہیں جا سکتی۔“

”تو تیرا مطلب ہے تیری ماں جھوٹ بولتی ہے... غضب خدا کا... اب ماں پر بھی شک کرے گا۔ ہاں میں نے مار ڈالا ہے... دفن کر دیا زمین کے اندر اسے... اب یقیناً آ گیا تجھے۔“ عذرا جہاں اس قدر چیخ رہی تھیں کہ فضیل کے لیے کان کے ساتھ فون لگائے رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے بنا کچھ کہے فون بند کر دیا۔ کال پھر سے آرہی تھی لیکن اس نے فون آف کر دیا۔ اس کے لیے اپنے پیروں پر کھڑے ہونا دشوار ہو رہا تھا۔ وہ جہاں کھڑا تھا وہیں بیٹھ گیا۔ اسے یقین نہیں تھا کہ جو کچھ اس کی ماں نے کہا ہے، وہ سچ ہے۔ اسے یقین تھا کہ اس کی ماں کہیں نہ کہیں غلط بیانی سے کام لے رہی ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے۔ وہ اپنے وطن کی سرزمین سے بہت دور تھا۔ دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اسے پچھتاؤؤں نے آن گھیرا۔ اسے لگتا تھا جیسے اچانک اس کی ساری دولت چھن گئی ہو اور وہ خالی ہاتھ رہ گیا ہو۔ پتا نہیں کتنے لمحے اسے یوں ہی بیچ راستے میں بیٹھے گزر گئے تھے۔ جی چاہتا تھا اندر کے طوفان کو باہر نکالے۔ اتنا چیخے چلائے کہ پوری دنیا کو خبر ہو جائے۔

”تم ٹھیک ہو؟“ رضوان نے اسے یوں بیچ راستے میں بیٹھے دیکھا۔ وہ خالی نظروں سے اسے دیکھے گیا جیسے

اس کے الفاظ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ شاید کچھ اور بھی بول رہا تھا لیکن اس کے کان کچھ سن نہیں پا رہے تھے۔ دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے دھندلی چھا رہی تھی۔ رضوان نے اس کے سامنے ہاتھ بڑھایا۔ اس نے رضوان کا ہاتھ تھام کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن اگلے ہی لمحے اس کی آنکھوں کے سامنے تاریکی سی چھا گئی۔

☆.....☆.....☆

معاذ نے فجر کے چلانے آواز سن کر بے ساختہ پیچھے دیکھا۔ کوئی بد صورت بھکارن تھی جس نے اس کا بازو تھام رکھا تھا اور وہ خوفزدہ سی اس سے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ معاذ تیزی سے چند قدم پیچھے گیا اتنے میں وہ اس بھکارن سے بچ کر معاذ کے پیچھے آن چھپی۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ معاذ نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر دلا سہ دیا۔ دس کا نوٹ نکال کر اس بھکارن کی طرف بڑھایا۔ بھکارن ٹکٹنگی باندھے فجر کو دیکھ رہی تھی۔ دس کا نوٹ جیسے اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔

”چل.. چلیں معاذ... یہاں سے جلدی چلیں۔“ فجر کی کانپتی آواز اسے سنائی دی۔ دوسری طرف بھکارن جس کا آدھا چہرہ چھلسا ہوا تھا۔ ہونٹ اور بایاں گال سکڑنے کی وجہ سے اسے شاید بولنے میں بھی دشواری پیش آرہی تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس کی آواز غوغاں سے زیادہ سمجھ نہیں آتی تھی۔ وہ اشارے سے کچھ سمجھانا چاہتی تھی، فجر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کچھ کہہ رہی تھی۔ معاذ نے دس کا ایک اور نوٹ اس کی طرف بڑھایا لیکن وہ بے نیاز تھی اسی طرح اشارے کر رہی تھی۔ معاذ کو اپنے ہاتھ پر فجر کے ٹھنڈے ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا جس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ وہ دونوں بایک کی طرف بڑھ گئے۔ بھکارن غوغاں کرتی ان کے پیچھے آرہی تھی لیکن بایک اشارٹ ہو چکی تھی۔

”کدھر چلیں اب؟“ معاذ نے اس سے پوچھا۔

”کہیں نہیں.... گھر چلیں بس۔“ اس کی آواز میں اب بھی خوف تھا۔

”ارے اتنا گھبرانے کی کیا بات ہے۔ ایک بھکارن سے ڈر گئی تم۔“ وہ چپ رہی۔ معاذ اس کا خوف دور کرنے کے لیے یوں ہی بے مقصد باتیں کرتا گیا۔ جس کے جواب میں وہ صرف ہاں ہوں کر رہی تھی۔ معاذ کو

اس کی غائب دماغی کا احساس ہو رہا تھا لیکن وہ اسے خوف سے تعبیر کر رہا تھا۔ چھٹی کے دن معاذ بہت اصرار کے بعد فجر کو اپنے ساتھ باہر کھانا کھلانے لایا تھا۔ واپسی پر وہ گروسری کے لیے بازار آئے تھے جب یہ واقعہ پیش آیا۔ گھر آ کر بھی فجر کچھ گھبرائی ہوئی سی نظر آرہی تھی۔ سامان سمیٹتے ہوئے وہ کچھ حواس باختہ سی دکھائی دے رہی تھی۔ معاذ کچھ دیر اس کی حالت نوٹ کرتا رہا پھر بول اٹھا:

”کیا تم اس بھکارن کو جانتی ہو؟“ وہ چونک اٹھی۔

”نن... نہیں تو۔“ اس کا چہرہ کچھ اور ہی کہہ رہا تھا لیکن معاذ نے اسے کریدنا مناسب نہ سمجھا۔

”پھر اس طرح پریشان کیوں ہو رہی ہو۔ یار ریلیکس... اب چھوڑ دو اس کے بارے میں سوچنا۔“

”میں اس کے بارے میں تو نہیں سوچ رہی۔“

”پھر اتنی ڈری ہوئی کیوں لگ رہی ہو؟“

”وہ... اس کا چہرہ۔“

”لگتا ہے کسی نے تیزاب پھینکا ہے اس کے چہرے پر۔ مجھے بھی بہت ترس آیا اس بیچاری پر... اس کے چہرے کا دایاں حصہ اور ہاتھ کافی شفاف تھے یقیناً اچھی صورت ہوگی اس کی کبھی۔“ فجر کے چہرے کا رنگ پھر سے پھیکا پڑنے لگا۔

”جانے دو یا راب... ہم اس کے بارے میں بات نہیں کریں گے۔ چلو آج اپنے بارے میں باتیں کرتے ہیں۔ ہماری شادی کو دو ماہ ہو چکے ہیں لیکن اس عرصے میں اپنی اسٹڈیز کی وجہ سے تمہیں زیادہ وقت نہیں دے پایا۔ خالہ نے بھی کچھ ٹائم نہیں دیا۔ فائنٹ نکاح کر کے جان چھڑائی اور بھاگ گئیں۔ تم اپنے بارے میں بتاؤ کچھ...“ اس نے دانستہ بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا لیکن وہ گھبرائی ہوئی سی انگلیاں چٹخانے لگی۔

”خالہ نے آپ کو میرے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟“ وہ نظریں ملائے بغیر اس سے گویا ہوئی۔

”نہیں...“ اس نے حیران نظروں سے اسے دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔

”آپ نے بنا کچھ جانے نکاح کیسے کر لیا مجھ سے؟“



”اس لیے کہ مجھے خالہ پر پورا بھروسہ ہے۔ وہ مجھے میری جان بھی مانگتیں تو میں لمحہ بھر ضائع نہ کرتا اور وجہ جانے بغیر جان دے دیتا۔“

اس نے معاذ کے چہرے کو دیکھا، اس کا سکون، اطمینان اور مسکراہٹ۔

”کیا میرے بارے میں سب جاننے کے بعد بھی یہ چہرہ ایسے ہی مسکرائے گا۔ میری طرف ایسے ہی محبت سے دیکھے گا یا پھر میرا حال بھی.....۔“ ذہن کے اندر ایک شور سا برپا تھا اور اس کے چہرے پر سکوت۔

”ہیلو۔“ اس نے اس کے سامنے چٹکی بجائی اور وہ ہوش کی دنیا میں لوٹ آئی۔ ”بہت اچھا لگ رہا ہوں آج میں؟“ اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ فجر گڑ بڑا گئی۔

”میں چائے لاتی ہوں۔“ وہ اٹھنے لگی۔ معاذ نے اس کا بازو تھام کر بٹھالیا۔

”نہیں... آج ہم صرف باتیں کریں گے۔ تم اپنے بارے میں بتاؤ میں تم کو اپنے بارے میں بتاؤں گا۔ ہمیں ایک دوسرے کے بارے میں علم ہونا چاہیے۔“

”آپ میرے بارے میں خالہ سے پوچھ لیجیے گا۔“

وہ سپاٹ لمبے میں کہتے ہوئے باہر نکل گئی اور معاذ کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر گئی۔ معاذ کے ذہن میں اس ڈائری کا خیال آیا جس کے نہ جانے کتنے ورق وہ سیاہ کر چکی تھی۔ الماری کھول کر اس کے کپڑوں کے نیچے اسے وہ ڈائری نظر آ گئی۔ اس نے جلدی سے پکڑی، الماری بند کی، ڈائری کو کھولنا چاہا لیکن برق رفتاری سے ایک خیال اس کے ذہن میں آیا اور اس ڈائری واپس رکھ دی۔ ”مجھے نکاح کے ان دو بولوں پر یقین ہے مائی ڈیر وائف! تم خود مجھے اپنے بارے میں بتاؤ گی اور میں اس وقت کا انتظار کروں گا۔“ اس کی سرگوشی میں یقین تھا۔

☆.....☆.....☆

کمرے کی بند فضاؤں نے کرم دین کی سوچ کے درتے کھول دیے تھے۔ جن میں سے زہرا بی بی کی یادیں چھن چھن کر آرہی تھیں اور وہ ان یادوں کی نرم گرم دھوپ میں اپنے وجود کے زخموں کو سینک رہا تھا۔ اسے وہ دن یاد آیا جب زہرا نے کالج جاتے ہوئے اسے کہا تھا کہ وہ گھنٹے بھر تک واپس آئے کیونکہ اس کی سہیلی کی سالگرہ تھی اور انھوں نے باہر جانا تھا۔

”بی بی جی آپ نے بڑے مالک سے اجازت لی تھی؟“ وہ پوچھے بغیر رہ نہ سکا۔ اس نے کرم دین کو کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا... تم مجھ پر شک کر رہے ہو؟ یعنی تم کو لگتا ہے کہ میں اپنے گھر والوں کو بے خبر رکھ کر یوں باہر گھومتی پھروں گی۔“ وہ کرم دین پر چڑھ دوڑی تھی۔

”جج... جی نہیں... میرا یہ مطلب نہیں تھا... میرا مطلب تھا کہ...“

”تمہارا جو بھی مطلب تھا اسے اپنے پاس رکھو اور منہ بند رکھو۔ میں نے ماں جی کو بتا دیا تھا۔ اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے میں بابا کو پریشان نہیں کر سکتی۔ تمہیں نہیں پتا انہیں کتنے کام ہوتے ہیں۔“

”جی بہتر۔“ وہ مرعوب ہو گیا۔ زہرا لمبی ہیل میں ٹک ٹک کرتی یہ جاوہ جا اور کرم دین سوچ کر رہ گیا۔ مالکوں کا حکم تھا کہ زہرا کو کالج سے گھر اور گھر سے کالج لے کر جانا ہے کہیں اور نہیں جبکہ وہ کچھ اور کہہ رہی تھی۔ اس نے حویلی کال کی لیکن بڑے مالک گھر پر نہیں تھے اور ان کا ذاتی نمبر بھی بند تھا لہذا وہ بات نہ کر پایا۔ ٹھیک ایک گھنٹے بعد وہ اپنی تین سہیلیوں کے ساتھ باہر نکل آئی۔ کرم دین کو اس کی سہیلیاں بالکل پسند نہ آئیں جو بات بے بات ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں۔ وہ ان کی کھسر پھسر تو سن نہیں پایا تھا لیکن یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اسی کے بارے میں باتیں کر رہی تھیں۔ میکڈونلڈ کے سامنے انھوں نے گاڑی رکوائی۔ کرم دین باہر ہی کھڑا رہا اور لوگوں کو اندر باہر آتے جاتے دیکھتا رہا۔ ایک گاڑی چڑچڑاہٹ کے ساتھ آ کر قریب ہی رکی۔ اندر سے تین چار عجیب سے حلیے والے لڑکے نکلے، گلے میں چین، ایک کان میں بالی، بد رنگی جینز پر شوخ رنگ شرتیں پہنے تیر کی طرح وہ کرم دین کے پاس سے گزر گئے۔ کرم دین ماتھے پر سلوٹیں ڈالے انھیں دیکھے گیا اور سوچنے لگا۔

”زہرا بی بی کو جلدی آ جانا چاہیے، کیسے کیسے عجیب لوگ آتے ہیں یہاں۔“ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ زہرا بی بی کی نگرانی کے لیے اندر ہی چلا جائے لیکن زہرا بی بی کا حکم نہیں تھا کہ وہ اندر آئے سو باہر ہی بیچ و تاب کھاتا رہا۔ پریشانی میں ادھر سے ادھر ٹپکتے ہوئے کبھی اس کی نگاہیں میکڈونلڈ کے دروازے کی طرف اٹھتیں اور کبھی گھڑی کی طرف۔ ایک گھنٹے بعد زہرا بی بی اپنی سہیلیوں کے ساتھ اسی انداز میں ہنستی کھلکھلاتی باہر آئی اور ابھی وہ سب گاڑی تک آئی تھیں کہ وہ لڑکے بھی ہاتھ پر ہاتھ مارتے باہر نکل آئے۔ کرم دین کے ماتھے کی تیوریاں کچھ اور

چڑھ گئیں۔ اس نے جلدی سے گاڑی اسٹارٹ کی۔ ایک بات اس نے نوٹ کی کہ زہرا کی سہیلی کے ہاتھ میں ایک بیگ تھا۔ وہی بیگ جو کچھ دیر پہلے اس نے ان لڑکوں میں سے ایک کے ہاتھ میں دیکھا تھا۔ زہرا بی بی کے حکم سے اس نے باری باری ان تینوں لڑکیوں کو ان کے گھر چھوڑا اور اب گاڑی حویلی کی طرف موڑ دی۔

”سنو کرم دین! میری ایک بات مانو گے؟“ اسے زہرا بی بی کی ملتچی سی آواز سنائی دی۔ یہ اس رعب دار آواز سے قطعاً مختلف تھی جو صبح اس نے سنی تھی۔

”جی کہیے۔“

”پہلے وعدہ کرو۔“ شیرینی میں ڈوبے الفاظ اس کے کانوں سے ٹکرارہے تھے۔

”آپ حکم کیجیے بی بی جی! آپ کا حکم ماننا میرا کام ہے یوں بات کر کے مجھے شرمندہ مت کریں۔“

”نہیں کرم دین پھر بھی تم وعدہ کرو ناں۔“ وہ عجیب الجھن میں پڑ گیا تھا۔

”وعدہ۔“ بی بی کی آواز پھر سے اسے سنائی دی۔

”جی وعدہ۔“

”تم میرے یہاں آنے کے بارے میں کسی کو مت بتانا۔“ وہ لمحہ بھر کو چپ کر گیا۔ اس نے ہونٹ بھینچ لئے۔ اس کا شک درست تھا۔ زہرا بی بی سب کو دھوکا دے رہی تھیں اور وہ لڑکے۔ کرم دین کا دماغ سنسانے لگا۔

”ایک شرط پر.... زہرا بی بی آپ بھی میری ایک بات مانیں پھر۔“ اس نے مرر سے دیکھا زہرا کے ماتھے پر سلوٹیں نمایاں ہوئیں لیکن ظاہر ہے کرم دین اس کے راز سے واقف تھا ایسا راز جس کے کھلنے کی صورت میں اس کے لیے بہت سی مشکلات پیدا ہو سکتی تھیں اس لیے اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی کہہ دیا:

”ہوں.... کیا شرط ہے؟“

”آپ ان لڑکیوں سے دوستی چھوڑ دیں یہ کوئی اچھی لڑکیاں نہیں ہیں۔“ زہرا نے زوردار قہقہہ لگایا اور ہنستے ہنستے بے حال ہو گئی:

”اچھا.... تم کو کیسے پتا چلا؟“

”بس مجھے پتا چل گیا... آنکھیں کھلی رکھتا ہوں میں۔ آپ کی ایک سہیلی نے ہاتھ میں جو بیگ پکڑ رکھا تھا وہ

اسے ان بد معاش لڑکوں نے دیا تھا کیونکہ میں نے کچھ دیر پہلے جب انھیں اندر جاتے دیکھا تو ان میں سے ایک کے ہاتھ میں وہ بیگ تھا۔“

”واہ بھئی... تم تو جاسوس ہو۔ پولیس فورس میں بھرتی ہو جاؤ بھلا یہاں کیا کر رہے ہو۔“ زہرا شوخی سے گویا ہوئی۔

”آپ نے بتایا نہیں کہ آپ میری بات مانیں گی یا نہیں؟“ کرم دین نہیں چاہتا تھا کہ زہرا بات بدلے۔ وہ اس سے یہ بات منوالینا چاہتا تھا کم از کم کسی طرح اپنے نمک کا حق ادا کرنا چاہتا تھا۔ جواب میں ایک بار وہ ہنس دی اور بولی:

”ارے کرم دین... تم تو خواخواہ میں میری سہیلیوں کے پیچھے پڑ گئے ہو حالانکہ ان میں سے ایک جو میرے دائیں ہاتھ کھڑکی کے ساتھ بیٹھی تھی ناں مریم! وہ تو تم پر فلیٹ ہو گئی ہے۔ اگر تم کو اچھی لگی ہے تو تمہارا ٹائٹ کافٹ کروادوں اس سے۔“

کرم دین جھینپ گیا۔ لمحہ بھر کچھ بول نہ پایا اسے زہرا بی بی سے ایسی بے باکی کی امید نہیں تھی۔

”ارے تم تو لڑکیوں کی طرح شرمارہے ہو۔“ وہ اپنی بات پر خود ہی لطف اندوز ہوئی۔ کرم دین کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا جواب دے۔ راستہ تیزی سے گزر رہا تھا۔ زہرا کے شریر جملے اس کے لب سی چکے تھے۔ وہ چاہنے کے باوجود اس پر غصہ نہیں کر پایا تھا۔ گھر قریب آنے سے پہلے زہرا برقع پہن چکی تھی۔ گاڑی مین گیٹ سے اندر داخل ہو چکی تھی۔ اترنے سے پہلے زہرا نے پھر سے ملتی نگاہ سے کرم دین کو دیکھا۔ اپنی بات دہرائی اور اندر چلی گئی۔ کرم دین کی شرط مجسم ہو کر اس کا مذاق اڑا رہی تھی اور وہ بڑے مالک کو کچھ بھی بتانے کا ارادہ ترک کر چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

عالیہ تنویر ایک بہت اچھی لڑکی تھی۔ اپرٹل کلاس گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے گھر میں ہمارے گھر کی طرح پابندیاں نہیں تھیں نہ ہی اس کے گھر والے اپنی بیٹیوں کے معاملے میں زیادہ تنگ دل اور تنگ نظر تھے۔ عالیہ نے انگریزی میڈیم کے مخلوط تعلیمی ادارے سے میٹرک کیا تھا۔ وہ قدرے خود اعتماد تھی لیکن اس نے

میرا مذاق نہیں اڑایا تھا بلکہ ہر معاملے میں میری مدد کرنے لگی۔ واپسی پر اس کی دین میری دین کے پاس کھڑی ہوتی تھی اس لیے میں پہلے دن سے ہی اس کا ہاتھ پکڑ کر سڑک پار کرتی تھی کیونکہ سڑک پر لوگوں اور ٹریفک کا اتنا جھوم ہوتا تھا کہ میرا دل گھبرانے لگتا تھا۔ تیز ہارنوں کی آوازیں، زن سے گزرتی موٹر سائیکلیں، گاڑیاں اور انسانوں کے سر ہی سر۔ پہلے دن اگر عالیہ میرے ساتھ نہ ہوتی تو شاید میں دو گھنٹے سڑک کے کنارے کھڑی رہ کر سڑک خالی ہونے کا انتظار کرتی رہتی۔ ایک اچھی بات تھی کہ اس نے میری مدد کر کے کبھی جتایا نہیں تھا۔ اتفاق سے ہمارے مضامین بھی ایک جیسے تھے اس لیے بہت سی کلاسز کے سیکشن بھی اکٹھے تھے۔

زہرا سے میری بہت کم بات ہوتی تھی۔ وہ کلاس میں بھی کبھی کبھار ہی دکھائی دیتی تھی۔ عالیہ سے دوستی کے بعد میں نے زہرا سے بات چیت کم کر دی تھی اس کی وجہ ایک تو زہرا کا اپنا تضحیک آمیز رویہ تھا، دوسرے عالیہ کی زہرا کے بارے میں رائے کا نتیجہ تھا:

”اس لڑکی کو تم کیسے جانتی ہو جس کے ساتھ ابھی تم بات کر رہی تھی۔“ عالیہ نے مجھ سے زہرا کے بارے میں پوچھا لیکن اس کا لہجہ کچھ ٹھیک نہیں تھا۔

”ہمارے فیملی ٹرمز ہیں ان کے ساتھ... کیوں... تم اس طرح کیوں پوچھ رہی ہو؟“ میں نے زیادہ تفصیل بتانا مناسب نہ سمجھا۔

”ایک تو تم بھی ناں... دنیا جہان سے بے خبر... ارے ان کا پورا گروپ کالج میں کس حد تک بدنام ہے تمہیں کچھ اندازہ بھی ہے۔“ میں نا سنجھی کی کیفیت میں اسے دیکھ رہی تھی۔

”کالج میں بہت کم آتی ہیں یہ، ڈٹس پر جاتی ہیں، کلاسز بنک کرتی ہیں اور پتا نہیں کیا کیا کچھ۔“

”اوہ....“ میں بس اتنا ہی کہ پائی تھی۔ اگرچہ زہرا کے رنگ ڈھنگ مجھے بدلے ہوئے محسوس ہو رہے تھے لیکن مجھے یہ علم نہیں تھا کہ یہ اس حد تک بگڑ چکی ہے۔ عالیہ کے ساتھ اس روز کی بات چیت نے مجھے اور محتاط کر دیا تھا میں زہرا سے کترانے لگی تھی۔ اس کی وجہ بھی میرے اندر کا خوف تھا، بدنامی کا خوف۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ لوگ میرے بارے میں بھی اسی قسم کی باتیں کریں۔ ویسے بھی پورا دن کلاسز لیتے ہوئے وقت گزرنے کا پتا نہیں نہیں چلتا تھا۔

کالج میں فن فیئر گزارا تو عالیہ نے ایک دن مجھے اپنے موبائل پر ایک لڑکے کی تصویر دکھائی۔  
 ”کیسا ہے یہ؟“ میں نے سرسری انداز میں تصویر دیکھی۔  
 ”کون ہے؟“

”تمہارا دیوانہ۔“ اس نے لاپرواہی سے کہتے ہوئے موبائل پکڑ لیا اور مجھے جیسے کرنٹ لگا۔

”عالیہ.....“ میری آواز بھرا سی گئی۔ مجھے عالیہ پر بے حد غصہ آنے لگا۔ ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں مجھے محسوس ہوا کہ عالیہ نے میرے ساتھ کوئی دھوکا کیا ہے اسی نے میری تصویر اس لڑکے کو دکھائی ہوگی۔ میں کالج سے نکلتی تو نقاب میں جاتی تھی۔ کوئی مجھے کیسے دیکھ سکتا تھا۔

”اررر... ارے میری بات تو سنو۔“ میں ناراض ہو کر جانے لگی کہ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے

پاس بیٹھا لیا۔

”پلیز فجر ایسے ناراض ہو کر مت جاؤ... پہلے میری بات سن لو پھر جو مرضی کرنا۔“ میرا عالیہ سے بات کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن اس کے بار بار اصرار سے میں اس کی بات سننے پر مجبور ہو گئی۔ مجھے آج بھی دکھ ہے کہ میں نے اس کی بات کیوں سنی لیکن ہونے والی بات ہو کر رہتی ہے۔ انسان قسمت سے لڑ نہیں سکتا جو کام جس طرح لکھا گیا ہو ویسے ہی ہوتا ہے ہاں دعا اس کے مضر اثرات میں کمی ضرور کر دیتی ہے یا پھر انسان میں حالات سے مقابلے کا حوصلہ دے دیتی ہے لیکن جو مقدر میں لکھا ہوتا لا نہیں جاسکتا۔ میرے مقدر کی خواری یہیں سے شروع ہوئی۔ میں بے حد خفا ہونے کے باوجود اپنی زندگی کی پہلی بہترین سہیلی کو اپنی صفائی کا موقع دے رہی تھی:

”یہ فضیل بشارت ہے۔ میرا فیس بک فرینڈ۔ فن فیئر کی جو پکس میں نے فیس بک پر اپ لوڈ کی تھیں ان تصویروں میں سے ایک میں تمہاری بھی تھی۔“

میں نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔ عالیہ نے مجھے تصویر دکھائی۔ گروپ فوٹو تھا۔ تصویر میری اکیلی کی نہیں تھی لیکن عالیہ کے ساتھ کھڑی میں خاصی نمایاں ہو رہی تھی۔

”اللہ کی قسم! فجر میں نے کسی بری نیت سے تصویر اپ لوڈ نہیں کی تھی بلکہ باقی تصویروں کے ساتھ غلطی سے ہو گئی تھی۔ میں نے وہاں سے ڈیلیٹ کر دی ہے اور میں کسی انجان کو کبھی بھی فرینڈ نہیں بناتی۔ فضیل میرے ساتھ

ایڈمی میں پڑھتا تھا، پڑھنے والا، اچھا لڑکا تھا اس لیے میں نے اس کی فرینڈ ریکویسٹ accept کی تھی۔ یہ برا لڑکا نہیں.....“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

”تو میں کیا کروں۔ تم جانتی ہو عالیہ مجھے یہ سب پسند نہیں ہے پھر بھی....“ دکھ سے میرے الفاظ کھوسے گئے۔

”مجھے پتا ہے۔ یقین کرو جب اس نے مجھ سے کہا کہ وہ تمہیں ایک جھلک دیکھنے کے بعد ہی پسند کرنے لگا ہے تو میں نے اسے بہت ڈانٹا تھا۔ صاف منع کر دیا لیکن اس نے میری مت مار رکھی تھی۔ یہ دیکھو چیٹ پڑھو اس کی۔“ عالیہ نے messenger پر مجھے اس کی بات چیت پڑھوائی۔ یہ ٹھیک تھا کہ عالیہ نے ہر طرح سے اس کی حوصلہ شکنی کی ہوئی تھی اور عالیہ اپنی غلطی پر شرمندہ بھی ہو رہی تھی، وہ بار بار مجھ سے معذرت کر رہی تھی۔ میرا دل اس کی طرف سے صاف ہو گیا۔

”پھر اب مسئلہ کیا ہے؟ جب تم اسے صاف لفظوں میں منع کر چکی ہو.... پھر مجھے یہ سب کیوں بتا رہی ہو؟۔“

”یار وہ میری جان کو آیا ہوا ہے... کہتا ہے کہ اگر میں نے اس سے تمہاری بات نہ کروائی تو وہ کل کالج کے گیٹ پر کھڑا ہو جائے گا۔“

”کیا مصیبت ہے... سب لوگ کیا سمجھیں گے؟۔“ مجھ پر ازلی گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔

”اسی لیے تو مجھے تم سے بات کرنی پڑ رہی ہے۔ تم ایک بار خود اسے صاف لفظوں میں منع کر دو، میری بھی جان چھٹے گی اس سے اور تمہاری بھی۔“

”لیکن کیسے؟۔“

”اس نے اپنا نمبر دیا ہوا ہے مجھے... تم میرے فون سے اسے کال کر کے صاف منع کر دو۔“

”ہاں ٹھیک ہے، ابھی نمبر ملاؤ۔“ عالیہ اور میں کالج کے نسبتاً کم گنجان حصے میں آ گئے۔ کچھ لڑکیاں ادھر ادھر کھڑی فون پر بات چیت میں مصروف تھیں۔ میں اور عالیہ جانتے تھے کہ کالج کے اس حصے میں لڑکیاں فون پر اکیلی کس سے بات چیت کیا کرتی ہیں۔ میرا دل دھڑکا تھا اور میں نے عالیہ کو غصے سے دیکھا۔ عالیہ نظریں چرا گئی۔ اس نے نمبر ملایا سرسری بات کر کے فون میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ مجھے اپنے ماتھے پر پسینے کی بوندیں محسوس



ہوئیں۔ ہاتھ کانپ رہے تھے۔ کسی لڑکے سے بات کرنے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ اگرچہ میں نے دل میں بہت کچھ سوچ رکھا تھا کہ میں اسے خوب برا بھلا کہوں گی، صاف لفظوں میں اسے منع کر دوں گی لیکن اس کی آواز سنتے ہی میری آواز تھرانے لگی میں نے اپنا رخ بستہ ہاتھ عالیہ کے بازو پر جمایا ہوا تھا ادھر فضیل بشارت ڈرامائی انداز میں اپنی محبت کا اظہار کر رہا تھا اور میں گنگ سنتی جا رہی تھی۔ پہلی بار کسی لڑکے سے اپنی خوبصورتی کی تعریف سنی تھی، اس کی گھمبیر آواز میں اپنے حسن کے قصیدے سنتے ہوئے میں بھول چکی تھی کہ میں اسے کیا کہنے والی تھی۔ آخر کسی طاقت نے مجھے جھنجھوڑ دیا۔ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا:

”کیا میرے سچے جذبوں کو پذیرائی ملے گی۔“

”نہیں۔“ میں نے سخت لہجے میں کہہ کر فون عالیہ کو پکڑا دیا اور وہاں سے بھاگ آئی۔ عالیہ میرے پیچھے پیچھے آئی تھی۔

”یار تم اتنی دیر سے اس کی بکواس کیوں سن رہی تھی۔ وہ سمجھ رہا ہے میں جان بوجھ کر اسے منع کرتی رہی ہوں۔ تم اس سے بات کرنا چاہتی ہو۔ یہ سب کیا ہے فجر!“ میں چپ رہی۔ میں اسے اپنی کیفیت بتا نہیں پا رہی تھی۔

”پلیز تم خود ہی اسے منع کر دو۔ میں کسی سے بات نہیں کر سکتی۔ مج... مجھے ڈر لگتا ہے۔“ عالیہ کو شاید میری بات سمجھ آ گئی تھی۔ وہ واقعی میری ہر بات بنا کہے سمجھ جاتی تھی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے حوصلہ دیا:

”اوکے ڈونٹ وری... میں خود ہی اس معاملے کو ہینڈل کر لوں گی۔ تم ڈرو مت۔“

مجھے لگا تھا کہ فضیل بشارت کا قصہ تمام ہو گیا ہے لیکن مجھے نہیں پتا تھا کہ یہ اس قصے کا آغاز ہے۔

☆.....☆.....☆

میکڈونلڈ جانے والا وہ واقعہ ایک دن کا قصہ ثابت نہ ہوا۔ زہرا بی بی اکثر ویڈیو اپنی سہیلیوں کے ساتھ کہیں نہ کہیں باہر جانے کا پروگرام ترتیب دیے رکھتی تھی اور وہیں پر اسی قسم کے حلیے والے لڑکے بھی دکھائی دیتے تھے۔ گھر میں اور گھر کے باہر زہرا بی بی کا حلیہ اتنا مختلف ہوتا تھا کہ کرم دین افسوس کیے بغیر نہ رہتا۔ ہر بار زہرا کرم دین کو کسی نہ کسی بہانے مالکوں تک یہ بات پہنچانے سے روک دیتی تھی۔ سب سے بڑی مصیبت زہرا بی بی کی سہیلی مریم تھی جس نے کرم دین کی زندگی مشکل بنا رکھی تھی۔ وہ ہر وقت اس کی نظروں کا حصار اپنے ارد گرد محسوس

کرتا تھا۔ اب تو اسے ہر روز گھر ڈراپ کرنا زہرا بی بی کی ذمہ داری ہو چکی تھی۔ دوسرے لفظوں میں یہ ذمہ داری کرم دین کی تھی۔ وہ بہانے بہانے سے کرم دین کو مخاطب کرنے کی کوشش کرتی۔ کرم دین انتہائی محتاط انداز میں اس کی باتوں کا جواب دیتا لیکن اس پر بھی مریم اور زہرا دونوں مل کر اس کے محتاط انداز کا خوب مذاق اڑاتیں۔ ایک دن مریم کو ڈراپ کر کے وہ لوگ واپس جا رہے تھے جب کرم دین نے دو ٹوک انداز میں زہرا بی بی سے بات کی:

”زہرا بی بی! آپ اپنی سہیلی کو منع کر دیں جی! وہ مجھ سے بات نہ کیا کرے۔“  
 ”ہاہاہاہاہا... کیوں تم کو شرم آتی ہے؟“ وہ اپنے مخصوص انداز میں اشارت لے چکی تھیں۔  
 ”نہیں جی... وہ بات نہیں ہے۔“

”ارے کرم دین! لڑکیوں کی طرح کیوں شر مارتے ہو... مرد بنو مرد... ایک لڑکی سے بات کرتے ہوئے شر مارتے ہو۔“

غیرت کے مارے کرم دین کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے مزید کوئی بات زہرا سے نہ کی اور فیصلہ کر لیا کہ وہ مالکوں سے بات کرے گا کہ اسے حویلی میں کوئی دوسرا کام دے دیں۔ زہرا شاید اس کی خاموشی کو کوئی معنی پہنچا چکی تھی۔ کچھ ڈر بھی تھا کہ اس کی حرکتوں کی خبر کرم دین نے گھر کے کسی فرد کو پہنچا دی تو اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔ اس لیے اس نے پھر سے جال پھیلانا شروع کیا:

”کرم دین! پلیز تم گھر میں کسی کو بھی میرے باہر گھومنے پھرنے کے بارے میں نہ بتانا... بابا جان مجھے جان سے مار دیں گے... تم کو ان کے غصے کو پتا ہے ناں۔“ اتنے عرصے میں پہلی بات کرم دین نے زہرا کو اس قدر سنجیدہ دیکھا تھا۔

”زہرا بی بی آپ کو سب پتا ہے کہ آپ کے گھر والوں کو یہ سب پسند نہیں ہے پھر بھلا آپ یہ سب کرتی کیوں ہیں؟“

”تھرل... ایڈونچر... مزا آتا ہے... تم نہیں سمجھو گے کرم دین! تم پر وہ پابندیاں نہیں ہیں جو مجھ پر ہیں... تم آزاد ہونا... بھائی شیردل آزاد ہیں... کہیں بھی جاسکتے ہیں... کوئی روک ٹوک نہیں... میرے پاس بھی تو جینے

کے لیے یہی دو سال ہیں... مجھے آگے پڑھنے کی اجازت نہیں ملے گی... چچا غلام نبی کے پاگل بیٹے سے میری شادی کر دیں گے بابا جان۔ اس لیے کہ میرے پیدا ہوتے ہی اس سے میری منگنی کر دی تھی بابا جان نے۔ سب کہتے ہیں سیدھا سادا ہے زمانے کی ہوا نہیں ہے... یہ نہیں کہتے کہ پاگل ہے وہ..... تم بتاؤ کرم دین میرا اور اس کا کوئی جوڑ ہے بھلا؟“ کرم دین نے ایک نظربیک مرر سے زہرابی بی کے چہرے پر لکھا کرب دیکھا اور دوبارہ سامنے سیدھی سڑک پر نظریں گاڑ دیں:

”میں کیا کہہ سکتا ہوں جی؟“ اس کے لہجے میں واضح بے بسی تھی۔

”تم کچھ کہہ نہیں سکتے لیکن کچھ کر سکتے ہو کرم دین! کیا تم میرے لیے معمولی سا کام بھی نہیں کرو گے؟“

”کیا کام؟“ کرم دین کے دل میں زہرابی بی کے لیے ہمدردی جاگ چکی تھی۔

”مجھے میری دو سال کی زندگی جینے دو۔ خوب گھومنے دو... سیر کرنے دو... اور... اور کسی کو کچھ نہ بتانا۔“ وہ کرم دین کی ہمدردی حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکی تھی اور کرم دین نے بھی زہرا کا ساتھ دینے کا ارادہ کر لیا تھا اسے یکدم زہرا بے حد مظلوم محسوس ہونے لگی تھی۔

”ٹھیک ہے زہرابی بی! میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا لیکن آپ اپنی سہیلی کو منع کر دیں کہ وہ مجھ سے بات نہ کیا کرے۔“ کرم دین کو مریم کی بے باک نگاہیں پھر سے یاد آ گئیں۔

”ہاہاہاہا... اوکے کہہ دوں گی اور کچھ....“

”نہیں کچھ نہیں۔“

جھٹکے سے دروازہ کھلا اور کرم دین ماضی کا جھروکا بند کر کے حال کی دنیا میں لوٹ آیا۔ شیردل اور غلام نبی کے ساتھ بڑے مالک ذکاء اللہ بھی تھے۔

”ہوں... تم کچھ نہیں بتاؤ گے پھر؟“ ذکاء اللہ کرم دین سے مخاطب تھا۔

”بڑے مالک میں سب سچ بتا چکا ہوں۔“ کرم دین مؤدب لہجے میں بولا۔

”بکواس کرتا ہے بابا جان یہ.... خون کھولتا ہے میرا... ختم کر دوں گا اس کمینے کو... اس کو تو میں ڈھونڈ ہی لوں گا... اس کا کام تمام کرنے دیں مجھے۔“ شیردل نے کرم دین کے بال کھینچ کر منہ پر گھونسا مارا۔ اس کے

چہرے کی سوجن میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔

”میرا قصور نہیں بے بڑے مالک۔“ کرم دین کو ذکاۃ اللہ سے کچھ رحم کی امید تھی۔

”کل شام تک کا وقت دے دو اس کو... کچھ بتائے تو ٹھیک ہے، نہ بتائے تو تمہاری مرضی جیسا چاہو اس کے ساتھ سلوک کرو۔“ ذکاۃ اللہ اتنا کہ کر چل دیا اور شیر دل اس کے قریب آیا اور اس کے بال کھینچ کر دھمکانے لگا:

”اگر کل شام تک تم نے مجھے نہ بتایا کہ زہرا کہاں ہے تو میں تمہیں بھوکے کتوں کے جنگلے میں بند کر دوں گا۔ صرف کل شام تک تم اپنی زندگی کی خیر منالو۔“ جھٹکے سے اس کے بال چھوڑ کر وہ اور غلام نبی باہر نکل گئے۔ ان کے جانے کے بعد کمرابند کر دیا گیا۔ کرم دین کل شام کے بارے میں سوچ سوچ کر ہلکان ہونے لگا:

”آپ نے ٹھیک نہیں کیا زہرا بی بی... آپ نے ٹھیک نہیں کیا یہ سب....“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اپنی خوفناک موت کا خیال اسے دہلا رہا تھا۔



”یار فجر! اس نے میرا دماغ خراب کیا ہوا ہے۔ اسے لگتا ہے کہ میں جان بوجھ کر اس سے تمہاری بات نہیں کرواتی۔“ عالیہ نے اس دن کینٹین میں بیٹھے ہوئے بات شروع کی۔

”تو میں کیا کروں؟ تم جانتی ہو مجھے اس سے بات نہیں کرنی۔“

”ہاں مجھے پتا ہے لیکن اس مصیبت کو کون سمجھائے۔ یہ دیکھو کل اس نے یہ وڈیو ٹس ایپ کی ہے۔ وہ اپنے بازو پر بلیڈ سے کٹس لگا رہا ہے کہتا ہے کہ اگر تم نے بات نہ کی تو خودکشی کر لے گا۔ مر جائے گا۔“ میں نے وڈیو دیکھی اور پریشان نظروں سے عالیہ کی طرف دیکھا:

”ہائے عالیہ! کیا کریں پھر۔“ بہتا خون دیکھ کر میں گھبرا گئی تھی۔

”ایسا کرو تم خود اس سے بات کر کے اسے سمجھا دو کہ وہ ان حرکتوں سے باز آجائے اور مجھے بھی پریشان نہ کرے۔“ اس روز عالیہ باقاعدہ مجھے یاد کرواتی رہی کہ کن الفاظ میں مجھے فضیل بشارت کو منع کرنا ہے۔ ہم دونوں کالج کے اسی حصے میں آ گئے۔ اس نے نمبر ملا کر مجھے فون پکڑا دیا۔ مجھ پر پھر سے پچھلی والی کیفیت طاری ہونے لگی۔ اپنی حالت سے میں خود بھی انجان تھی کہ اتنی پریکٹس کے بعد بھی میں اس سے کچھ کہہ کیوں نہیں پاتی۔ پچھلی

دفعہ بھی جب فضیل سے بات کرنے کے بعد میں گھر گئی تھی تو اس کے لفظوں کا سحر مجھے جکڑے رہا۔ دلوں میں کھوٹ ہو تو شیطان کے لیے گھر بنانا آسان ہو جاتا ہے اور ایک بار شیطان داخل ہو جائے تو اسے نکالنا آسان نہیں ہوتا۔ وہ دھیرے دھیرے دل کے ساتھ ساتھ دماغ پر بھی قبضہ کر لیتا ہے۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت چھین لیتا ہے اور انسان اس کے بتائے تباہی کے راستے پر قدم رکھ دیتا ہے۔

”میرا خیال ہے عالیہ... مجھے کبھی کبھی اس سے بات کر لینی چاہیے۔ اس میں کچھ غلط تو نہیں۔“ اس سے بات کرنے کے بعد میں نے عالیہ سے کہا۔

”کیا مطلب؟ یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟ تمہیں اندازہ بھی ہے؟“ عالیہ بے حد حیران تھی۔

”ہاں... میرا خیال ہے اس میں کوئی برائی بھی نہیں... سب لڑکیاں بات کرتی ہیں اور پھر میں کون سا اس کے ساتھ ڈیٹ پر جا رہی ہوں۔ چند دن کی بات ہے اس کی دلچسپی ختم ہو جائے گی۔“ میں اس سے نظریں چرا کر کہہ رہی تھی۔

”نہیں فجر تم اس سب کے لیے میرا فون استعمال نہیں کرو گی۔ اگر تم اس سے بات کرنے کا فیصلہ کر چکی ہو تو خود سے کچھ سوچو کہہ تمہیں اس سے کیسے بات کرنی ہے۔“ عالیہ خفا ہو گئی لیکن وہ واضح الفاظ میں مجھے کچھ برا بھی نہیں کہہ رہی تھی کیونکہ یہ سب اسی کی غلطی کی وجہ سے ہوا تھا لیکن اس کے دو ٹوک الفاظ مجھے تنبیہ کر رہے تھے کہ وہ میرا ساتھ دینے کو تیار نہیں ہے۔

”تو پھر تم ہی مجھے بتاؤ میں کیا کروں... وہ کہتا ہے مر جائے گا۔“ میں نے بال پھر سے اس کے کوٹ میں ڈالی۔

”مرنا اتنا بھی آسان نہیں ہوتا... یہ لڑکے لڑکیوں کو امپریس کرنے کے لیے اسی طرح کی حرکتیں کرتے ہیں۔ آگے تمھاری مرضی۔“ کلاس شروع ہو گئی اور ہم کلاس کی طرف بڑھ گئے۔ اس روز پورا دن عالیہ نے مجھ سے ٹھیک سے بات نہیں کی۔ مجھے بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں نے فضیل کو انکار کیوں نہیں کیا۔ اس سے ہفتے میں ایک بار بات کرنے کی ہامی کیوں بھری۔ ہم انسان اپنی غلطیوں کو شیطان کے کھاتے میں ڈالنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اپنے نفس کی کمزوری شیطان کی آڑ میں چھپا دیتے ہیں لیکن مجھے اپنا احتساب کرنا ہے۔ مجھے اپنی

غلطی تسلیم کرنی ہے اور سچ یہی ہے کہ مجھے فضیل کی باتیں اچھی لگنے لگی تھیں۔ میرے نفس کی کمزوری مجھے اکسا چکی تھی۔ اس لیے میں نے فضیل کی خودکشی والی بات کو آڑ بنا کر عالیہ کو قائل کر لیا کہ مجھے ہفتے میں ایک بار فضیل سے بات کر لینی چاہیے۔ عالیہ نے مجھے اپنا فون استعمال کرنے کی اجازت دے دی اور ہم پہلے پہل ہفتے میں ایک بار اور پھر دن میں ایک بار فون پر بات کرنے لگے۔

عالیہ مجھے اکثر سمجھاتی کہ میں ٹھیک نہیں کر رہی لیکن پھر اس نے سمجھانا چھوڑ دیا شاید اسے لگتا تھا کہ میں سمجھنے کی حد سے آگے نکل گئی ہوں اور بات واقعی ٹھیک تھی میں سمجھنے کی حد سے آگے ہی نکل گئی تھی۔ عقل پر پردہ تو پہلے ہی پڑا تھا، اب وہ کچھ اور دبیز ہو گیا تھا۔ گناہ میں کشش ہوتی ہے۔ جب تک انسان گناہ کے مقناطیسی میدان سے دور رہے، فہم و فراست سے کام لیتا ہے اور جب اس دائرے میں داخل ہو جائے تو سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں رنگ آلود ہو جاتی ہیں اور انسان گناہ کی مقناطیسی کشش کے اثرات کا شکار ہونے لگتا ہے۔ ایک قوت ہے جو گناہ کے مقناطیسی اثرات کو دفع کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے سچے ایمان کا جذبہ لیکن میرے اندر یہ جذبہ عرصہ دراز سے بیمار پڑ چکا تھا۔ کمزور ہو چکا تھا۔ اللہ سے دوری میرے ایمان کی کمزوری تھی اس لیے شیطان کی طاقت اپنا کام دکھا رہی تھی۔ سو یہ طاقت پوری طرح مجھ پر غالب آنے لگی تھی۔

☆.....☆.....☆

ایک ہفتے کی بیماری نے فضیل کو کمزور کر دیا تھا۔ اسے sunstroke ہو گیا تھا۔ بقول رضوان اگر وہ اسے یوں بچ راستے میں بیٹھے رہنے دیتا تو شاید وہ قابل علاج بھی نہ رہتا۔ دوسری طرف فضیل کی حالت ایسی تھی جیسے اسے جینے میں کوئی دلچسپی نہ رہی ہو۔ ہفتہ بھر گھر سے سب کے فون آتے رہے تھے اس نے بھی سے اس کے بارے میں پوچھا تھا لیکن سب کا جواب ایک ہی تھا کہ وہ رات گئے گھر سے بھاگ گئی تھی۔ فضیل یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ اکیلی کیسے جاسکتی ہے اور کہاں؟ وہ راستوں سے بے خبر، اکیلے گھر سے نکلنے سے خوفزدہ، بلکہ سڑک کر اس کرتے ہوئے بھی وہ اس قدر خوفزدہ ہو جاتی تھی کہ اپنے ساتھ چلنے والے کا ہاتھ پکڑے آنکھیں بند کیے تیزی سے سڑک پار کرتی تھی۔ فضیل نے کئی بار اسے عالیہ تنویر کے ساتھ سڑک پار کرتے دیکھا تھا۔ وہ اپنے گھر بھی نہیں جاسکتی تھی اس لیے کہ اس کے گھر میں اس کی موت کی خبر پہنچی تھی۔ فضیل کو وہ دن اچھی طرح یاد تھا جب

وہ اس کے کہنے پر اس کے گھر والوں کا پتا کرنے گیا تھا۔ گھر کے باہر لگے شامیانے دیکھ کر اس نے کسی محلے دارنی سے اس کی وجہ دریافت کی تھی:

”اماں سب ٹھیک تو ہے... یہاں راستہ کیوں بند ہے؟“

”سب ٹھیک کہاں ہے بیٹا! دو موتیں ہوئی ہیں اس گھر میں.... بیٹی کالج کے ساتھ ٹرپ ٹرپ پے گئی تھی کسی ڈیم شیم پے... وہیں ڈوب کے مر گئی، لاش تک نہیں ملی اور ماں بے چاری یہی خبر سن کر چل بسی۔ دل کا دورہ پڑ گیا نمائی کو...! اسپتال جانے سے پہلے ہی ختم... آج چالیسواں ہے دونوں کا۔“

وہ کتنے دن تک اس کو یہ سب بتا نہیں پایا تھا۔ ٹکڑوں میں یہ دونوں خبریں سنائی تھیں۔ ماں کی موت کی خبر نے اسے اتنا رلا دیا تھا کہ اپنے بارے میں یہ خبر سن کر وہ بولی:

”چلو اچھا ہے..... ابو جان نے مجھے بہت پہلے مرا ہوا سمجھ لیا تھا۔ دفن بھی کر دیا... اچھا کیا۔“

فون کی گھنٹی نے اسے چونکا دیا۔ اس نے قریب پڑا فون اٹھایا۔

”فصل کیسا ہے بیٹا اب؟“ عذرا جہاں کی محبت میں ڈوبی آواز سنائی دی۔

”زندہ ہوں اماں ابھی۔“ اس کی آواز میں اکتاہٹ تھی۔

”مریں تمہارے دشمن... بس کرا اب اس کا سوگ منانا... شجاع بھی کہہ رہا تھا کہ اب تجھے کام پر جانا شروع کر دینا چاہیے۔ بس جلدی سے اس کے پیسے پورے کر کے واپس آ جا... ادھر ہی کوئی کام کر لے... بڑی یاد آتی ہے بیٹا تیری۔“

”جی۔“

”اپنا خیال رکھا کر... کھانا وقت پر کھایا کر۔“

”جی۔“

”اور زیادہ سوچا نہ کر... سوچنے سے کچھ نہیں ہوتا۔“

”جی۔“

”چل ٹھیک ہے اب تو آرام کر اور کل سے کام پر چلے جانا بیٹا۔“



”جی۔“ اس نے فون رکھ دیا۔ وہ چاہ کر بھی ماں سے ٹھیک سے بات نہیں کر پارہا تھا۔ اسے لگتا تھا کہیں نہ کہیں اس کے غائب ہونے میں اس کی ماں کا ہاتھ ہے لیکن وہ کس سے حقیقت جاننے کی کوشش کرتا۔ گھر میں کوئی بھی اسے سچ نہیں بتائے گا اس بات کا اسے پورا یقین تھا۔ پھر ایک سوچ نے اس کے اندر کی ہمت بحال کی۔ حقیقت کا پتا اسے خود ہی لگانا تھا اور اس وقت جب وہ پاکستان جاتا لیکن وہ پاکستان اس وقت جاسکتا تھا جب شجاع کے پیسے چکا لیتا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ جلد از جلد شجاع کے پیسے چکا کے ٹکٹ خرید کر پاکستان جائے گا اور خود حقیقت کا پتا لگائے گا۔

☆.....☆.....☆

رات کا پتا نہیں کون سا پہر تھا جب کمرے کا دروازہ کھلا اور بوڑھا کریم بخش اندر داخل ہوا۔  
 ”اوئے کرم دینا... چل جلدی کر اوئے... اٹھ کھڑا ہو۔“ وہ تیزی سے اس کی رسیاں کھول رہا تھا۔  
 ”کیا بات ہے چاچا... سب خیر ہے؟“  
 ”سب خیر نہیں ہے تجھے پتا ہے کل شام انھوں نے تجھے بھوکے کتوں کے آگے ڈال دینا ہے... چل جلدی کر نکل یہاں سے.... بھاگ جا دور... صبح ہونے سے پہلے جتنی دور جاسکتا ہے چلا جا یہاں سے۔“ وہ اسے کھڑکی کی طرف دھکیلتا ہوا کہ رہا تھا۔  
 ”نہیں چاچا... وہ لوگ بڑے ظالم ہیں.. انھیں پتا چل گیا کہ تو نے مجھے یہاں سے بھگایا ہے تو وہ تجھے نہیں چھوڑیں گے چاچا۔“  
 ”اوئے جو رات قبر میں آنی ہے اسے کوئی نہیں ٹال سکتا... ویسے بھی میری عمر کتنی ہے۔ تو جوان جہان ہے... میں تجھے ایسی دردناک موت مرتے نہیں دیکھ سکتا۔ جا بھاگ جا یہاں سے۔“ کرم دین نے کچھ پس و پیش سے کام لیا۔

”اوئے جادو بھی ہو یہاں سے جھلیا!“ کرم دین سسکتے ہوئے کریم بخش سے گلے ملا اور کھڑکی سے کود گیا۔ کریم بخش نے اپنی بوڑھی آنکھیں صاف کیں۔ ماضی اپنے آپ کو دہراتا ہے۔ ایک وقت تھا جب اس کے باپ نے کسی کو اسی کمرے سے بھاگنے میں مدد کی تھی اور آج اس نے بھی یہی کیا تھا۔ خالی کمرے کو تالا لگا دیا اور

واپس اسی جگہ آکر بیٹھ گیا جہاں پہلے ہی وہ چاروں حقے کے کش لگا رہے تھے۔ شیدے کی نظریں اس کی نظروں سے ملیں اور دونوں مسکرائے۔

”چاچا! آج تیرا کوئی بہانہ نہیں چلے گا... چل اس دن والی بات بتا۔“ پہلا بولا۔

”کون سی بات؟“ کریم بخش نے نظریں چرائیں۔

”اوہو... وہی بات جو تو نے اس دن آدمی بتائی تھی کہ پیر کرامت اللہ نے کیا کیا تھا؟“

”اوائے مجھے کیا پتا... میں تو خود بچہ تھا تب۔“

”فیروی کچھ نہ کچھ تو پتا ہے تجھ کو۔“ شیدا بولا اور باقی سب بھی اصرار کرنے لگے۔

”میرے ابا نے بتایا تھا۔ یہیں چاکری کرتا تھا۔ بڑے پیر صاحب بہت بیمار ہو گئے تھے آخری وقت میں... کرامت اللہ، عبداللہ سے بڑا تھا لیکن اس کا ماں جایا نہیں تھا۔ عبداللہ کی ماں خاندان سے باہر کی تھی۔ مہاجر ہو کر آئی تھی ہندوستان سے آزادی کے وقت۔ پیر صاحب نے آسرا دیا تھا لیکن زیادہ جی نہیں سکی بے چاری۔ کرامت اللہ کو لگتا تھا کہ اسی کو گدی سوہنی جائے گی لیکن بڑے پیر صاحب نے اسے کہا تھا کہ تیرے اندر طمع ہے... طمع کے ساتھ تو اللہ کے بندوں کی خدمت نہیں کر سکتا۔ اس لیے گدی عبداللہ کو سوہنی گئی لیکن کرامت اللہ نے بڑے پیر صاحب کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ باہر مشہوری کروادی کہ اسے گدی سوہنی دی گئی ہے۔ اس نے اپنے بندوں کے ذریعے عبداللہ کو قید کروادیا۔ ابا کہتا تھا کہ یہیں اسی کمرے میں بند کیا تھا عبداللہ کو۔“ اس نے مقفل کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ چپ کر گیا۔

”پھر چاچا؟“ ان میں سے ایک نے پوچھا۔ کریم بخش خواب کی سی کیفیت میں بول رہا تھا۔

”پھر بس... یعقوب کو اطلاع ہوئی تھی کہ یوسف کو بھیڑیا کھا گیا۔ یوسف کی خون آلود قمیص اس کے باپ کو دیکھا کر سوتیلے بھائیوں نے خود کو سچا ثابت کیا تھا۔ یعقوب رو رو کر اندھا ہو گیا تھا۔ ہر دور میں یوسف پر ظلم ہوتا ہے، ہر دور میں یوسف پر ظلم کرنے والے سوتیلے بھائی ہوتے ہیں۔ تاریخ اپنا آپ دہراتی ہے۔ پیر صاحب کو بھی ایسی ہی خون آلود قمیص دکھائی گئی تھی کہ عبداللہ شکار پر گیا تھا جنگلی جانوروں کا شکار بن گیا۔ اس کے کٹے پٹے کپڑے ملے ہیں بس۔ پیر صاحب کو چپ لگ گئی تھی۔ ابا کہتا تھا، ان کو فالج ہو گیا تھا۔ بول نہیں پاتے تھے

کچھ بھی، لیکن نظریں جیسے کہتی تھیں کچھ۔ ابا خدمت کیا کرتا تھا ان کی۔ ایک دن کچھ بول رہے تھے ہلکی سی آواز میں، ابا نے بڑی مشکل سے سنا تھا کہتے تھے، عبداللہ کو بچاؤ۔ بڑی مشکل سے ابا کو ان کی بات سمجھ میں آئی تھی۔ ابا نے کسی نہ کسی طریقے سے پتا لگالیا تھا عبداللہ کا۔ پتا چلا لیا تھا کہ وہ اس کمرے میں قید تھا۔ ”وہ پھر چپ ہو گیا۔“

”پھر ابا نے جب رات کے پچھلے پہر دروازہ کھولا تو وہ غائب تھا کمرے سے... لوہے کی زنجیریں کمزور رسیوں کی طرح ٹوٹی ہوئی تھیں اور عبداللہ غائب تھا۔“

”وہ کدھر غائب ہو گیا چاچا!“

”سنا ہے موکل بھگا کے لے گئے تھے اس کو۔“ کریم بخش نے ہوا میں بات اڑائی۔

”اچھا۔“ ان سب کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور خوفزدہ نگاہیں مقفل دروازے کی طرف اٹھیں۔

”جس رات عبداللہ یہاں سے نکلا تھا اسی رات پیر صاحب کا انتقال ہو گیا۔ وفات سے پہلے بھی ابا ان کے پاس تھے۔ وہ کہتے تھے کہ پیر صاحب کے آخری الفاظ یہی تھے کہ جھوٹ کا سلسلہ شروع ہونے جا رہا ہے امام بخش۔ اب یہاں کچھ نہیں ہے۔ اتنا کہہ کے وہ چلے گئے تھے دنیا سے۔ اور پھر وہی ہوا جو میری آنکھوں نے دیکھا۔ کچھ نہیں ہے یہاں سب جھوٹ ہے، گدی کی ہوس ہے، لالچ ہے، طمع ہے بس اور سب جھوٹ ہے... مگر ہے۔“ وہ چپ کر گیا۔ سب خاموش تھے۔ فضا میں حقے کی گڑ گڑاہٹ اور جھینگروں کی آواز کے علاوہ کوئی آواز نہیں تھی۔



مجھے فضیل سے بات کرتے ہوئے مہینا بھر ہو چکا تھا۔ اس کی باتیں مجھے بہت دلچسپ لگتی تھیں۔ ہر روز گھر جا کر میں ارادہ کرتی تھی کہ اب اس سے بات نہیں کروں گی لیکن میرے ارادے اس کی آواز سنتے ہی ریت کی بھر بھری دیوار ثابت ہوتے تھے۔ فضیل نے مجھے میری سالگرہ پر ایک موبائل فون گفٹ کیا تھا۔ یہ گفٹ مجھے کالج کے گیٹ کے باہر ایک چھوٹے بچے نے پکڑا یا تھا۔ عالیہ تنویر نے کچھ جتناقی نظروں سے مجھے دیکھا تھا لیکن میرے اندر سے بدنامی کا خوف جذبہ ایمان کی طرح ختم ہو چکا تھا۔ فضیل نے مجھے جو موبائل گفٹ کیا تھا وہ معمولی تھا لیکن میرے لیے بیش قیمت تھا کیونکہ میں پہلی بار اپنے ہاتھ میں اپنا ذاتی موبائل پکڑے خود کو کسی اور

دنیا میں محسوس کر رہی تھی۔ اب مجھے عالیہ کے فون کی محتاجی نہیں رہی تھی۔ میں نے موبائل فون اپنے کالج بیگ میں چھپا رکھا تھا۔ گھر میں سب کاموں سے فارغ ہونے کے بعد میں اپنے کمرے میں آجاتی اور کتاب میں موبائل چھپا کر فضیل سے ٹیکسٹنگ میں مصروف رہتی۔ امی یہی سمجھتی تھیں کہ میں پڑھائی میں مصروف ہوں۔ انسان جب پہلی بار اپنوں کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو جائے تو اندر کے سارے خوف کھو جاتے ہیں۔ بے خوفی اس کی جگہ لینے لگتی ہے اور میں... میں بھی نجانے کس کس کو دھوکا دے رہی تھی، گھر والوں کو، خود کو اور فضیل کو.....

یہ سچ ہے کہ فضیل مجھ سے سچ محبت کرتا تھا۔ اس کے لفظ لفظ سے سچائی ٹپکتی تھی۔ آج اگر میں اپنے دل کو ٹٹول کر دیکھوں تو احساس ہوتا ہے کہ مجھے اس سے محبت نہیں تھی۔ میں اپنے گھٹے ہوئے ماحول سے تنگ آئی ہوئی تھی اور اس گھٹن میں فضیل کی باتیں مجھے تازہ ہوا کی طرح محسوس ہوتی تھیں جہاں میں کھل کر سانس لے پاتی تھی۔ فضیل کی باتیں خوابوں اور خیالوں کی باتیں تھیں۔ وہ خود خیالی دنیا میں رہنے والا انسان تھا اور مجھے بھی انھی خیالوں میں قید رکھتا تھا۔ میں بے وقوفی کی آخری منزل پر کھڑی اس کی خیالی دنیا پر حقیقت کا گمان کرنے لگی تھی لیکن میری اس خیالی دنیا پر حقیقت کی کاری ضرب اس روز لگی جب امی نے مجھے بتایا کہ پیر ذکاء اللہ نے ابو جان سے اپنے بیٹے شیردل کے لیے میرا رشتہ مانگا ہے۔ شیردل کا نام سنتے ہی مجھے سرخ خونا کی آنکھوں کا خیال آگیا اور میں نے بے اختیار جھرجھری لی۔ پیر ذکاء اللہ کے یہاں منعقد ہونے والے درس اور محفلوں میں اکثر میرا اس سے سامنا ہو جاتا تھا اور اس کی خوفناک آنکھیں مجھے بے حد خوفزدہ کر دیتی تھیں۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ان آنکھوں کا مجھے ساری زندگی سامنا کرنا پڑے گا۔ میں نے امی کے سامنے احتجاج کیا تھا لیکن امی ہمیشہ کی طرح مظلومیت کی تصویر بنی بیٹھی تھیں۔ ابو اور بھائیوں سے کچھ بھی کہنا بے کار تھا ان کے لیے پیر صاحب کا کہنا حدیث تھا۔ وہ ان کی بات سے کبھی بھی انکار نہ کرتے۔ شیردل سے میری شادی والا معاملہ شاید بہت جلد طے پا جاتا لیکن ایک حادثے نے اس قصے کو طول بخش دیا۔ یہاں بھی زہرا میرے کام آئی تھی۔ زہرا کی موت کی خبر ایسا سانحہ تھا جس کی دھول میں یہ بات دب گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

مالکوں کی غضب ناک نگاہیں کریم بخش پر جمی ہوئی تھیں۔ کریم بخش کے ہونٹوں پر ایک ہی چپ تھی۔

شیردل اور غلام نبی زہریلی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ انھیں اس بوڑھے پر ظلم کے پہاڑ توڑنے کے لیے ذکاء اللہ کے ایک اشارے کا انتظار تھا۔

”آخری بار... آخری بار پوچھوں گا کہ وہ کہاں غائب ہوا، اگر تم نے سچ نہ بتایا تو میں بھول جاؤں گا کہ تیری تین پشتوں نے اس حویلی کے مکینوں کی خدمت کی ہے۔“

”میرا جواب وہی پہلے والا ہوگا۔ مالک! میں جب یہاں آیا تو رسیاں کھلی پڑی تھیں اور وہ غائب تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ یہاں کوئی ہوائی چیز ہے جس نے اسے غائب کیا ہے... جیسے بابا عبداللہ....“

”بس....“ ذکاء اللہ کی گرجدار آواز نے کریم بخش کی بات کاٹ دی۔ ”پاگل مت بناؤ مجھے... میں اپنے باپ کی طرح بے وقوف نہیں ہوں۔ فیصلہ ہو گیا شیردل! غلام نبی! دو خبریں پھیلا دو ایک حویلی کے اندر اور ایک باہر... مسجد میں اعلان کروادو کہ پیر ذکاء اللہ کی بیٹی کرنٹ لگنے سے مر گئی۔ بجلی کی تنگی تاروں کو چھونے سے سڑکے سواہ ہو گئی۔ لاش اتنی مسخ ہو گئی کہ شکل پہچانی نہیں جاتی اس لیے فوراً جنازہ اٹھایا جائے گا اور دوسری خبر حویلی کے اندر مشہور کر دو کہ اس بوڑھے کریم بخش کی بیٹی ہمارے ڈرائیور کرم دین کے ساتھ بھاگ گئی۔“

”نہیں۔“ کریم بخش کے دل پر کسی نے گھونسا مارا اور وہ درد سے بلبلاتا اٹھا۔ ”نہیں مالک! میری دھی کا کوئی قصور نہیں اسے کچھ نہ کہنا۔“ وہ ہاتھ جوڑے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور وہاں کھڑے تینوں نفوس اس کی فریاد سے بے نیاز تھے۔ ”میں... میں سب کو آپ کا اصل چہرہ دکھا دوں گا... چلا چلا کر سچ بتا دوں گا... بتاؤں گا کہ کتنے میلے دل ہیں تم لوگوں کے... ظالمو!“

”بیٹی کے غم میں پاگل ہو گیا ہے بے چارہ... جاؤ اسے لوگوں کی باتیں سننے اور ذلیل و خوار ہونے کے لیے باہر گلی میں پھینک دو۔ پرانا ملازم ہے ہاتھ مت لگانا اس کو... ساری زندگی ہمارے کام آیا ہے... اب اس کی بیٹی ہمارے کام آئے گی۔ ہم جس مشکل میں پھنسے ہوئے ہیں وہی ہمیں اس مشکل سے نکالے گی۔ آخر کب تک زہرا کے اپنی ماسی کے گھر رہنے والا ڈراما کام آسکتا ہے۔ بس آج ہی رات وہ واپس آئی اور کرنٹ لگنے سے مر گئی... کیوں کریم بخش ٹھیک ہے ناں۔“ کریم بخش پاؤں پکڑے اپنی بیٹی کی زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔ شیردل اسے گھسیٹتا ہوا باہر لے گیا۔ پیر ذکاء اللہ اور غلام نبی ضروری کاموں میں مصروف ہو گئے کیونکہ کل حویلی سے جنازہ



زہرا کرٹ لگنے سے مری تھی۔ اس کی موت کی خبر سن کر مجھے کتنی دیر یقین ہی نہیں آیا تھا۔ میں بھی امی کے ساتھ حویلی گئی تھی۔ اس کی میت کو چہرے تک ڈھانپا گیا تھا۔ کوئی بھی اس کا چہرہ نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس لیے کہ سنا تھا کہ اس کی لاش اس قدر جل گئی ہے کہ دیکھنے کے قابل بھی نہیں رہی۔ مجھے اس دن سچ مچ بہت رونا آرہا تھا۔ کچھ بھی تھا زہرا کے ساتھ میں نے تین سال گزارے تھے۔ میں اس کی ڈھکی ہوئی میت کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ وہ اتنی لمبی تو نہیں تھی جتنی مرنے کے بعد محسوس ہو رہی تھی۔ شاید یہ بات اتنے لوگوں میں صرف میں نے محسوس کی تھی۔ مجھ رہ رہ کر زہرا کے ساتھ گزرا ہوا وقت یاد آرہا تھا۔ مجھے یکدم اس چاندی کے چھلے کا خیال آیا جو میری دادی نے مجھے دیا تھا۔ میں ہر وقت وہ چھلا پہنے رکھتی تھی لیکن ایک دن وہ زہرا نے مجھ سے مانگ لیا۔ میں نے اسے دے دیا تھا لیکن میت والے گھر میں میں اپنا چھلا واپس نہیں مانگ سکتی تھی۔

زہرا کی کھٹکناقی ہنسی مجھے اپنے کانوں میں گونجتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی شوخ اور شریر آواز مجھے بار بار اپنے ہونے کا احساس دلا رہی تھی۔ مجھے لگتا تھا جیسے وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوگی اور شرارت بھری آواز میں بولے گی کہ وہ مذاق کر رہی تھی لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اس کا جنازہ اٹھا دیا گیا اور کوئی ہنستی کھٹکناقی آواز وہاں سنائی نہیں دی۔ صرف رونے چلانے کی آوازیں تھیں۔ زہرا کی اماں چپ تھیں، کوئی آنسو ان کی آنکھوں میں نہ آیا، یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی اور کی بیٹی کا جنازہ اٹھ رہا ہو۔ کوئی ماں اپنی اولاد کی موت پر اتنا ضبط کیسے کر سکتی ہے۔ حویلی کے در و دیوار کا مصنوعی پن مجھے بچپن سے ہی محسوس ہوتا آیا تھا۔ اس لیے اب مجھے اس ماحول کے غیر معمولی پن سے حیران ہونے کی عادت نہیں رہی تھی۔ گھر آنے کے بعد امی اور چچی نجانے کتنے دن زہرا کی اچانک موت اور اس کی ماں کے صبر و ضبط کا قصہ چھیڑتی رہیں۔ میں بھی یقیناً زہرا کے بارے میں سوچ سوچ کر ہلکان ہوتی رہتی اگر وہ پہلے کی طرح میری واحد سہیلی ہوتی۔ عالیہ اور فضیل کی وجہ سے میں بہت دن تک زہرا کے غم میں مبتلا نہیں رہی اور بہت جلد یہ قصہ فراموش کر دیا۔



وہاں سے نکلنے کے بعد بھی کرم دین کو چاچا کریم بخش کا خیال ستاتا رہا۔ پتا نہیں ظالموں نے اس بچارے کے ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا مولوی اللہ دتا کا بڑا بیٹا لاہور شہر میں سرکاری نوکری کرنے لگا تھا۔ وہ کچھ دن اسی کے پاس رہا پھر ایک جگہ ڈرائیور کی نوکری مل گئی اور وہیں پر رہائش کا انتظام ہو گیا۔ لاہور میں رہنا اس کے مفاد میں نہیں تھا وہ کبھی بھی ان لوگوں کی نظروں میں آ سکتا تھا لیکن یہاں سے جانے سے پہلے وہ زہرابی بی کی تلاش کرنا چاہتا تھا۔ شام سات بجے کے بعد اسے نوکری سے چھٹی ملتی تھی۔ یہی وہ وقت تھا جب وہ زہرابی بی کی تلاش میں نکلتا تھا۔ باری باری وہ اس کی سبھی سہیلیوں کے گھر جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ سب سے پہلے وہ ثانیہ کے گھر آیا۔ دروازہ کسی بچے نے کھولا تھا۔ اس نے اپنا تعارف کروایا اور اس کا انتظار کرنے لگا۔

”ہاں... کیا چاہیے؟“ ثانیہ کا لٹھ مارتا انداز اسے تپا گیا لیکن وہ صبر سے برداشت کر گیا۔

”زہرابی بی کے بارے میں کچھ علم ہے آپ کو؟ پندرہ دن سے لاپتا ہیں وہ۔“

”نہیں مجھے کچھ پتا نہیں... میری اس سے کالج میں ہی ملاقات ہوئی تھی بس۔“ یہ کہہ کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔ عائشہ کا جواب بھی اس سے کچھ مختلف نہیں تھا۔ اس نے اللہ کا نام لیا اور آخری اُمید کے طور پر مریم کے گھر جا پہنچا۔ دروازہ اسی نے کھولا تھا:

”ارے تم... تم کرم دین ہونا... زہرا کے ڈرائیور؟“

”جی بی بی جی! آپ زہرابی بی کے بارے میں کچھ جانتی ہیں؟ وہ پندرہ دن سے لاپتا ہیں۔“

”کیا پندرہ دن سے... تم... تم اندر آؤ... اندر بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔“ مریم نے اسے اندر آنے کی دعوت دی لیکن وہ ہچکچا گیا۔

”نہیں جی... آپ یہیں پر مجھے کچھ بتادیں۔“

”ارے نہیں کرم دین... رات ہو رہی ہے دروازے پر بات کرنا مناسب نہیں ہے... تم اندر آؤ۔“ وہ اس کے اصرار پر اندر آ گیا۔ مریم نے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر اسے اندر بٹھایا۔ باقی سب کی نسبت مریم کا گھر ایک معمولی محلے میں تھا۔ گھر کی حالت سے بھی پتا چلتا تھا کہ مکینوں کے حالات کچھ اچھے نہیں ہیں۔ وہ اسے بٹھا کر چلی گئی تھی۔ اس دوران میں کرم دین کمرے کی پلستر اکھڑی دیواروں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اسی پلستر پر بنتی مٹی



تصویروں میں اسے زہرابی بی کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔

”کاش... کاش ایک بار مجھے آپ کا ہاتھ چل جائے۔“ اتنے میں مریم چائے لے کر اندر داخل ہوئی۔  
”اوہ... اس کی کیا ضرورت تھی۔“ کرم دین اٹھ کھڑا ہوا۔

”بیٹھ جاؤ کرم دین... تم مہمان ہو... کسی مہمان کو ایسے ہی جانے نہیں دیتے۔“ اسے مریم کے لب و لہجے میں واضح فرق محسوس ہو رہا تھا۔ یہ وہ مریم نہیں تھی جس کی بے باک نگاہوں سے کرم دین خائف رہتا تھا۔ اس نے ڈھنگ سے شلوار قمیص پہن رکھی تھی جو سلوٹوں سے بھری ہوئی تھی لیکن ڈھیلی ڈھالی سی تھی.... ویسی چست ہرگز نہیں تھی جیسی وہ کالج میں پہن کر آتی تھی۔ دوپٹا سر پر نہیں تھا لیکن سلیقے سے شانوں پر جما ہوا تھا۔ اس نے چائے کرم دین کو پکڑائی۔ وہ چائے پینے لگا تو مریم گویا ہوئی:

”میری زہرا سے آخری ملاقات اسی روز ہوئی تھی... نیوائیر نائٹ پر ہی....“ نیوائیر نائٹ کے ذکر پر کرم دین کے ذہن میں بھی ایک جھماکا سا ہوا۔ یاد کا ایک سایہ سالہرا گیا۔

رات کے نو بجے تھے جب حویلی کی ایک ملازمہ نے بتایا کہ شریفاں کی طبیعت خراب ہے اسے فوراً اسپتال لے کر جانا ہے اور جلدی سے گاڑی نکال کر پچھلے دروازے کی طرف لانے کو کہا۔ پچھلے دروازے کے قریب سرونٹ کو اٹرز تھے اس لیے کرم دین کو کوئی شک نہیں گزرا تھا۔ وہ گاڑی اسٹارٹ کر کے انتظار کر رہا تھا کہ ملازمہ نے اماں شریفاں کو لا کر گاڑی میں بٹھا دیا۔ وہ بڑی سی چادر میں سر تاپا لپیٹی ہوئی تھی۔ اماں شریفاں حویلی کی پرانی ملازمہ تھی۔ کرم دین نے اسے ہمیشہ سے اسی حالت میں دیکھا تھا۔ چھوٹے سے قد کی دبلی پتلی، سفید بال کس کے چوٹی میں بندھے ہوئے، پان کھا کھا کر ہونٹ اور دانت چوڑے اور کتھے کے رنگ میں رنگے ہوئے اور تیزی غصیلی آواز۔ کچھ بھی تھا وہ دل کی نرم تھی اور کرم دین کا بہت خیال رکھتی تھی کہ اس نے وقت پر کھانا کھا لیا کہ نہیں۔ اگر وہ کہیں باہر کام سے گیا ہوتا تو اس کے لیے کھانا الگ نکال کر رکھتی تھی اور کسی ملازم کے ہاتھ گرم کر کے بھجوا دیتی تھی۔ اس لیے اس کی طبیعت کی خرابی کا سن کر کرم دین لمحے کی تاخیر کیے بنا ہی گاڑی نکال کر حویلی کے پچھلے دروازے پر آن پہنچا تھا۔ ملازمہ اماں شریفاں کو گاڑی میں بٹھا کر چل دی۔ وہ حیران تھا کہ ساتھ کوئی اور کیوں نہیں آیا۔ وہ اکیلا اس بیمار عورت کو کیسے لے کر جائے گا۔

”تم ساتھ نہیں آؤ گی؟“ اس نے ملازمہ سے پوچھا۔

”نہیں... مجھے اور بھی کام ہیں۔ بس تم ہی لے جاؤ۔“

”اچھا۔“ اتنا کہ کر اس نے گاڑی اشارٹ کر دی۔

”اماں طبیعت زیادہ خراب ہے کیا؟“ اس نے اماں سے پوچھا۔ جواب ندارد۔

”اماں سب ٹھیک ہے؟“ اس کا دھیان پیچھے تھا جہاں ہنوز خاموشی تھی۔ اس نے گاڑی روک دی اور باہر

نکلنے کے لیے گاڑی کو ان لاک کیا:

”کرم دین!۔“ اس کی سماعتوں کو دھوکا ہوا تھا۔ آواز اماں شریقاں کی تو نہیں تھی... یہ تو زہرا بی بی کی آواز تھی

۔ ”گاڑی چلاؤ جلدی۔“ ایک لمحے کے لیے اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے۔

”ارے گاڑی چلاؤ ناں... کیا سوچ رہے ہو بدھوا۔“ چادر کی گٹھری سے آواز دوبارہ سنائی دی۔ وہ پس

و پیش کا شکار تھا۔

”اوہو... چلاؤ ناں گاڑی ابھی بتاتی ہوں۔“ آخر اس نے گاڑی اشارٹ کر دی۔

کچھ دور جانے کے بعد اس گٹھری میں سے زہرا بی بی کی آواز سنائی دی: ”میری ایک سہیلی کے گھر فنکشن ہے

۔ اس نے مجھے آنے کی خاص تاکید کی ہے۔ بابا جان تو گھر میں ہیں نہیں۔ بھائی شیر دل نے مجھے کبھی بھی آنے کی

اجازت نہیں دینی تھی اس لیے میں بڑی ماں جی سے پوچھ کر آ گئی۔“

کرم دین کے ماتھے پر سلوٹیں تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ اس بار بھی وہ دھوکا کر رہی ہے لیکن اب کچھ نہیں

کر سکتا تھا۔ اگر زہرا بی بی نے اپنے سہیلی کے یہاں جانے کی ٹھان لی تھی تو وہ وہاں ہر صورت جا کر رہتی۔ کرم

دین کو کئی بار کا تجربہ تھا وہ اسے اس کے کسی بھی مقصد میں روکنے سے ہمیشہ ناکام رہا تھا۔ لہذا کچھ کہنا سننا بے کار

تھا۔

”جانا کہاں ہے؟“

”شہر سے کچھ آگے فارم ہاؤس ہے لیکن پہلے مریم کو اس کے گھر سے پک کرنا ہے باقی سب خود ہی آئیں گی

۔“ کرم دین گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اتنی سردی، دھند اور شہر سے باہر کا سفر۔ اسے شدید کوفت ہو رہی

تھی۔ مریم کو اس کے گھر سے لیا۔ خلاف توقع وہ عبایا پہنے ہوئے تھی۔ کرم دین کو بڑی حیرت ہوئی۔ خیر وہ زہرا بی بی کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچا۔ فارم ہاؤس کے اندر داخل ہوئے تو دونوں نے اپنی چادر اور عبایا اتار دیا۔ ان کا حلیہ ایسا تھا کہ کرم دین نے بے اختیار اپنی نگاہیں جھکا لیں۔ لگ بھگ دونوں ایک سے حلیے میں تھیں۔ سیلو لیس چست ٹاپ اور ٹخنوں سے کافی اونچی کیپریز، بالوں کی دو تین لٹیں مختلف رنگوں میں رنگی ہوئیں اور تیز میک اپ۔

”زہرا بی بی آپ اس حلیے میں۔“

”اوہو... کرم دین... تم تو چپ ہی کرو۔ آج کا ڈریس کوڑا ہے یہ... بس تم یہیں پارکنگ میں رکو میں دو، تین گھنٹے تک آ جاؤں گی۔“

”نہیں آپ ذرا جلدی آ جائیں تو بہتر ہے۔“

”اوکے۔“ وہ عجلت میں کہتے ہوئے چل دی۔ پارکنگ میں آٹھ دس گاڑیاں کھڑی تھیں اور کچھ وقفے وقفے سے آرہی تھیں۔ عجیب و غریب حلیوں میں لڑکے لڑکیاں اندر جا رہے تھے۔ کرم دین اب اس قسم کے مناظر دیکھنے کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔ وہ کچھ دیر گاڑی میں بیٹھا رہا پھر آگ کے اس الاؤ کے پاس آکھڑا ہوا جہاں اس جیسے اور ڈرائیور اور سکیورٹی گارڈز وغیرہ کھڑے تھے۔ ایک گارڈ نے سب کو چائے دی جو اس وقت کرم دین کو نعمتِ متبرکہ معلوم ہوئی۔ سب ایک دوسرے سے بات چیت میں مصروف تھے۔

”میری بیٹیاں ایسی ہوں تو میں انھیں زندہ قبر میں اتار دوں۔“

”پتا نہیں ماں باپ کہاں ہیں ان کے؟“

”ماں باپ بھی ایسی ہی کسی پارٹی میں گئے ہوں گے، ان کو کون سا پروا ہے کہ ان کی اولاد کیا کرتی پھرتی ہے۔“

”آہا... کیا زمانہ آ گیا ہے بھائی... بے غیرتی کو بھی فاشن (فیشن) کا نام دے رکھا ہے دنیا نے۔“

”قیامت کی نشانیاں ہیں بھائی سب۔“ کرم دین کا دل ان کی باتوں سے ادبے لگا۔ وہ گاڑی میں آکر بیٹھ گیا۔ اس کا دل چاہتا تھا اندر جائے اور زہرا بی بی کو گھسیٹ کر لے آئے لیکن انسان جو چاہتا ہے، اکثر وہ کر نہیں

پاتا۔ تین گھنٹے گزر گئے تھے۔ کرم دین نے زہرابی بی کے فون پر کئی بار کال کی لیکن اس نے فون نہیں اٹھایا۔ وہ عمارت کی طرف بڑھ گیا تا کہ خود انھیں بلا کر لے آئے۔ گارڈ نے اُسے اندر جانے سے منع کر دیا۔ اس نے گارڈ کو پیغام دیا کہ زہرابی بی کو باہر آنے کے لیے کہے۔

”ابھی تو بارہ بجے ہیں۔ پارٹی شروع ہوئی ہے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے تک آئیں گے سب باہر۔ ہمیں اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔“

کرم دین اپنا سامنہ لے کر واپس آ گیا۔ ڈرائیوروں کے گروہ میں چائے کا ایک اور دور چل رہا تھا۔ انھوں نے کرم دین کو بھی ہاتھ کے اشارے سے ادھر آنے کو کہا لیکن اس نے اشارے سے ہی منع کر دیا۔ اس کا دل بے چین ہو رہا تھا۔ دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ رات کے دو بجے عمارت کا دروازہ کھلا اور اس نے لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ لڑکے لڑکیوں کو باہر نکلتے دیکھا۔ وہ بے چینی سے زہرابی بی کا انتظار کر رہا تھا لیکن وہ ابھی تک باہر نہیں آئی تھیں۔ ایک گارڈ نے اشارے سے کرم دین کو بلایا۔ وہ عمارت کی طرف بڑھا۔ مریم لڑکھڑاتی زہرا کو سنبھالتے ہوئے دہری ہوئی جا رہی تھی۔ اس نے کرم دین کو جلدی آگے آنے کو کہا۔ کرم دین کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ عجیب بے ڈھنگے حال میں تھی۔ قدم کہیں رکھتی کہیں پڑتے تھے۔ کرم دین نے مریم کے ساتھ مل کر زہرا کو سہارا دیا اور اسے گاڑی تک لے آیا۔ کرم دین کا دماغ سنسار ہا تھا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ مریم کو اٹھا کر باہر پھینک دے۔ اس کے سرخ چہرے سے شاید مریم کو بھی خوف آرہا تھا۔

”اس نے ڈرنک کیا ہے غلطی سے۔“ گاڑی چل دی تھی، بہت دیر کے بعد مریم کی آواز آئی۔ کرم دین نے ہونٹ بھینچ کر گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ مریم اس دوران میں عبایا پہن چکی تھی اس نے زہرا کو چادر اوڑھانا چاہی لیکن وہ ہوش میں نہیں تھی اس لیے بار بار پیچھے دھکیل دیتی۔

”کرم دین تم اس حالت میں اسے گھر کیسے لے کر جاؤ گے؟“

”یہ تو پہلے سوچنا چاہیے تھا انھیں بھی اور آپ کو بھی۔“ مریم کو کرم دین کی پھنکارتی ہوئی آواز سنائی دی۔

”میں نے زہرا کو منع کیا تھا لیکن اس نے میری بات نہیں سنی۔ وہ کسی کی بھی نہیں سنتی۔“ کرم دین نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کا خون کھول رہا تھا۔ مریم کا گھر آیا تو وہ اتر کر چل دی۔ اب کرم دین کے لیے امتحان تھا کہ وہ

کیا کرتا۔ رات کے تین بجے اس حالت میں وہ زہرا کو حویلی لے کر نہیں جاسکتا تھا۔ اس کی اپنی پوزیشن مشکوک ہو جاتی۔ وہ گاڑی یہاں کہیں روک بھی نہیں سکتا تھا۔ آخر اس نے ملازمہ کو کال کی۔ کئی بار کال کرنے کے بعد ملازمہ کی نیند سے بوجھل آواز سنائی دی۔

”میں زہرا بی بی کو لے کر آ رہا ہوں۔ حویلی کے پچھلی طرف کا دروازہ کھولو، بی بی کی حالت کچھ اچھی نہیں ہے۔“ اتنا کہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ اب گاڑی روک کر اس نے پیچھے کا دروازہ کھولا۔ زہرا بی بی کا چہرہ تھپتھا کر اس نے اسے ہوش دلانے کی کوشش کی۔ اس نے مندی مندی آنکھوں سے کرم دین کو دیکھا:

”کرم دین... انھوں نے زبردستی مو... مو... مجھے۔“

”آپ یہ چادر اوڑھ لیں۔ ہم حویلی جا رہے ہیں۔“ یکدم وہ رونے لگی۔

”نن... نہیں... میں ادھر نہیں جانا... وہ... وہ ماریں گے... مو... مو... مجھے۔“ اس نے رونا شروع کر دیا۔

”آپ یہ چادر اوڑھ لیں زہرا بی بی!“

”کرم دین... کرم دین... تم... تم مجھے مارو... میں... میں بہت بے... بوری ہوں ناں... تم... تم مجھے مارو۔“

اس نے کرم دین کے ہاتھ پکڑ کر اپنے منہ پر تھپڑ مارنے شروع کر دیے۔

”نہیں... بی بی... میں یہ نہیں کر سکتا... یہ میرا حق نہیں... مجھے آپ کو صحیح سلامت حویلی پہنچانا ہے بس۔“

”صحیح سلامت... میں صحیح سلامت کہاں ہوں... مجھے ایسا نہیں کرنا تھا... کرم دین... مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا... ان... انھوں نے مجھے شیشے میں... پت... پتائیں کیا ڈال کے دیا... تم مارو ناں مجھے... گھر میں بس... کسی کو نہ بتانا کچھ بھی۔“ وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑے ہوئے تھی۔

”ٹھیک ہے میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا... آپ یہ چادر اوڑھ لیں اچھی طرح۔“ وہ پھر رونے لگی۔

”تت... تم نہیں بتاؤ گے لل... لیکن سب کو پتا چل جائے گا... مم... میں ایسے کیسے جاؤں گی۔“

”آپ فکر مت کریں... میں نے انتظام کر لیا ہے۔ کسی کو کچھ پتا نہیں چلے گا۔“ وہ چادر لپیٹ چکی تھی۔ کرم

دین واپس ڈرائیونگ سیٹ پر آیا۔ گاڑی اسٹارٹ ہو چکی تھی۔ زہرا تھوڑی تھوڑی دیر بعد کچھ نہ کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ کبھی رونے لگتی، کبھی ہنسنے لگتی۔ کرم دین کے اعصاب تنے ہوئے تھے اسے خوف تھا کہ اگر کسی نے دیکھ لیا تو

پتا نہیں کیا ہوگا۔ گاڑی حویلی کے پچھلے دروازے پر رکی تو اس نے ملازمہ کو کال کی۔ چند لمحوں کے بعد ملازمہ نے دروازہ کھول دیا:

”کسی کو شک تو نہیں ہوا؟“

”بڑی بی بی آئی ہیں ساتھ... انھیں پتا چل گیا تھا۔“

”اوہ پھر؟“

”کرم دین! اسے احتیاط سے اندر لے آؤ۔“ بڑی بی بی (زہرا کی والدہ) کی دروازے کی اوٹ سے آواز آئی۔ وہ زہرا کو سنبھال کر اندر تک چھوڑ آیا۔

”اللہ تمھارا بھلا کرے کرم دین... اللہ کے واسطے کسی سے اس کی حالت کے بارے میں کچھ نہ کہنا... ورنہ اس کا باپ اسے مار دے گا... یہ کچھ پیسے رکھ لو۔“ بڑی بی بی کی آواز سے واضح بے بسی ٹپک رہی تھی۔

”نہیں بی بی جی آپ پیسوں کی بات کر کے مجھے شرمندہ کر رہی ہیں... اس حویلی کی عزت پر میری جان بھی قربان ہے۔“ وہ کرم دین کو دعائیں دیتی ہوئی چلی گئیں۔

”کرم دین... کہاں کھو گئے؟“ مریم کی آواز پر وہ ماضی سے حال میں لوٹ آیا تھا۔

”کچھ نہیں... آپ کچھ کہہ رہی تھیں۔“

”ہاں... نیو ایئر نائٹ پر میں آخری بار ملی تھی زہرا کو... وہ رات بہت بھیا تک رات تھی۔ میرا سارا طلسم ٹوٹ گیا تھا۔ اس رات کے بعد میں نے توبہ کر لی تھی کہ میں ایسے گروپس سے دور رہوں گی۔ وہ کوئی عام پارٹی نہیں تھی۔ اس رات انھوں نے ڈرگز اور ڈرنکس کا ریجنج بھی کیا ہوا تھا۔ کچھ لڑکے لڑکیاں شوق سے یہ سب خرافات استعمال کر رہے تھے لیکن جو منع کرتے تھے انھیں زبردستی ڈرنک کروایا جاتا تھا، جوس میں ملا کر بہانے سے دے رہے تھے۔ اتنی غلاظت اور بے ہودگی دیکھ کر میرا دل تنگ پڑنے لگا۔ میں نے زہرا سے کہا تھا کہ وہ چلے وہاں سے... لیکن وہ کہاں سنتی ہے۔ زہرا کو بھی زبردستی انھوں نے بہت پلا دی تھی۔ میں اس ہجوم سے نکل کر چھپ گئی تھی۔ اسی وقت میں نے توبہ کر لی اور عہد کیا کہ صحیح سلامت وہاں سے نکل جاؤں تو ان سب کاموں سے دور ہو جاؤں گی۔ میرا باپ بچا رادل کا مریض ہے، ماں محنت کر کے ہم تینوں بہن بھائیوں کے اخراجات پورے کر

رہی ہے۔ وقتی اثریکشن مجھے اس راستے پر لے آئی تھی لیکن بظاہر چمکتی دھمکی زندگی کے کالے بھیانک سائے میں نے اس ایک رات میں دیکھ لیے تھے۔ اللہ نے میری عزت رکھی اگر اس رات کی بھٹک بھی میرے ماں باپ کو پڑ جاتی تو شاید وہ زندہ نہ رہتے۔ زہرا کی طرح میرے عیبوں پر پردہ ڈالنے والا کوئی کرم دین میرے ساتھ نہیں تھا۔“ اس نے نم آنکھوں کے ساتھ کرم دین کو دیکھا۔ کرم دین نے ایک نظر اس پر ڈال کر نظریں جھکا لیں۔

”اس لیے میں اس دن کے بعد ثانیہ، عائشہ اور زہرا کسی سے بھی نہیں ملی اور نہ ہی کسی سے بات کی۔ پرانا نمبر بھی چینج کر لیا۔ سب دوستیاں ختم کر دیں لیکن وہ گئی کہاں؟ اور کیسے؟“

کرم دین نے ٹھنڈی سانس لی۔ وہ کہنے سے قاصر تھا کہ یہ بھی اس کی بے وقوفی اور اندھے اعتبار کا نتیجہ ہے۔

☆.....☆.....☆

فضیل کو پاکستان آئے پانچواں دن تھا۔ عذرا جہاں اپنے بیٹے کے واری صدقے جارہی تھیں۔ فضیل کو یہ سب حد درجہ مصنوعی دکھائی دے رہا تھا۔ وہ دل پر جبر کر کے ماں کی بات سنتا تھا۔ اس کی پوری کوشش ہوتی کہ گھر میں ہر کسی کو نظر انداز کرے۔ وہ لیٹا لیٹا چھت کو گھورتا رہتا یا پھر بے مقصد باہر سڑکیں ناپتا رہتا۔ سمجھ نہیں آتا تھا کہ وہ اسے کہاں تلاش کرے، کس طرح اس کا سراغ لگائے۔ اسے کسی حال میں چین نہیں پڑتا تھا۔ پاکستان آنے کے بعد اس کی بے چینی بڑھ گئی تھی۔ دہلی میں وہ گھنٹوں کام کیا کرتا تھا اور جب تھک کر گرنے والی کیفیت ہوتی تو سو جاتا لیکن یہاں فراغت ہی فراغت تھی اس لیے ذہن کی رو بھٹک بھٹک جاتی۔ اس کی ہنسی، اس کی گھبراہٹ، اس کا رونا، ایک ایک انداز یاد آتا۔ اگرچہ وہ جانتا تھا کہ اسے پالینا مشکل تھا لیکن اس نے یہ نہیں سوچا تھا یوں پا کر کھودے گا۔ اسے پالینے کے بعد وہ خود کو سواتویں آسمان پر محسوس کر رہا تھا لیکن اب کھودینے کے بعد ایسا لگتا تھا جیسے اس کا چند روزہ ساتھ کوئی خواب تھا۔ ایسا خواب جو اچانک آنکھ کھلنے سے ٹوٹ جاتا ہے اور اب وہ دوبارہ سونے کی کوشش میں ہلکان ہوا جا رہا تھا تا کہ خواب کا سلسلہ وہیں سے شروع کر سکے جہاں سے ٹوٹا تھا لیکن ایک بار نیند کھلنے پر جو خواب ٹوٹ جاتے ہیں۔ وہ دوبارہ کب دکھائی دیتے ہیں۔ فضیل کے لیے بھی فجرِ ارمغان کا ساتھ ایک خوبصورت خواب تھا۔ جس کی تعبیر جانے بغیر وہ اسے حقیقت بنانے کی خواہش میں ہلکان



رات کیا سوئے کہ باقی تمام عمر کی نیند اڑ گئی  
خواب کیا دیکھا کہ دھڑکا لگ گیا تعبیر کا  
کس طرح پایا تجھے پھر کس طرح کھویا تجھے  
مجھ سا منکر بھی تو قائل ہو گیا تقدیر کا

”ایسے کیوں بیٹھے رہتے ہو فضیل! کچھ کھانے کو لاؤں؟ تم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔“ وہ چھت پر نظریں  
جمائے نجانے کتنے گھنٹوں سے لیٹا ہوا تھا کہ امینہ بھا بھی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔  
”نہیں بھا بھی مجھے بھوک نہیں ہے۔“ اس نے کروٹ لی۔

”فجر کے بارے میں سوچتے رہتے ہو؟“  
”تو کیا کروں؟ کوئی مجھے کچھ بتاتا بھی تو نہیں... اتنے لوگ ہیں گھر میں... سب کے سہارے چھوڑ کر گیا تھا  
میں اس کو... وہ کیسے چلی گئی... میں کیسے مان لوں کہ کسی کو بھی اس کے بارے میں علم نہیں ہے۔“ وہ اٹھ کر بیٹھ  
گیا، حد درجہ بیزار لہجے میں گویا ہوا۔

”ایک دن پہلے بات ہوئی تھی میری اس سے.....“  
”اسی دن جب تمہاری اس سے بات ہوئی تھی... وہ اکیلی نہیں تھی۔ اماں بھی وہیں تھیں... تم دونوں کی بات  
سن رہی تھیں وہ۔“

”کیا مطلب؟“  
”فضیل غلطی تمہاری بھی ہے... تم کو پتا تھا کہ اس کے ساتھ گھر میں کیسا سلوک ہوگا... کیوں گئے تھے اسے  
یہاں چھوڑ کر، اور فون پکڑا دیا اس کو جیسے اسے تم سے فون پر بات کرنے کی آزادی ہوگی۔“ وہ نا سنجھی کے عالم میں  
امینہ بھا بھی کو دیکھ رہا تھا۔

”تمہارے جانے کے کچھ دن بعد اماں نے اس سے فون لے لیا تھا۔ شاید وہ چاہتی تھیں کہ تمہیں اس سے  
بدگمان کر دیں اور تم اسے طلاق دینے پر مجبور ہو جاؤ لیکن اتفاق سے انہیں کچھ زیادہ کوشش نہیں کرنی پڑی یہ موقع

قدرت نے ان کو خود فراہم کر دیا تھا۔ اس روز فون پر بات کرتے ہوئے تم نے کہا تھا کہ تمہارا اس سے ٹکاح نہیں ہوا۔“ امینہ بھابھی نے کچھ جتنی نظروں سے اسے دیکھا اور وہ نظریں چرا کر رہ گیا۔

”فون کے اسپیکر آن تھے۔ یہ بات میں نے بھی سنی تھی اور میرے ساتھ اماں اور صوفیہ نے بھی۔“ فضیل کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ بدترین خدشے سر اٹھائے کھڑے تھے اور وہ جلد از جلد امینہ بھابھی کی بات سننا چاہتا تھا۔

”پھر... پھر کیا ہوا بھابھی! اماں نے... اماں نے....“

”اماں نے کچھ نہیں کیا اس وقت... وہ چپ رہی تھیں لیکن مجھے پتا تھا کہ یہ چپ کسی آنے والے طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ میرا دھیان اماں کی طرف ہی تھا پھر میں نے رات کے وقت انہیں کال کرتے سنا کہ وہ کچھ لوگوں کو اسے اغوا کرنے کے لیے کہہ رہی تھیں اور پروگرام ترتیب دے رہی تھیں۔ اسی رات جب سب سو گئے تو میں نے ایک جوڑا کپڑوں کا اور کچھ رقم دے کر اسے یہاں سے بھاگادیا۔“ آخری جملے ادا کرتے ہوئے امینہ بھابھی کی آواز کچھ اور نیچی ہو گئی۔

”لیکن کہاں؟..... اماں.....“ وہ بے بسی سے ہاتھ ملنے لگا۔

”پتا نہیں... لیکن جہاں بھی گئی محفوظ ہے وہ... یہاں سے بہتر حالت میں ہوگی۔“

”آپ کو کیسے پتا؟“ امینہ نظریں چرا گئی۔ فضیل کو یقین ہو گیا کہ امینہ اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ جانتی ہے۔ اس سے پہلے کہ اصرار کر کے امینہ سے کچھ اگلوانے کی کوشش کرتا باہر سے شور کی آوازیں آنے لگیں، چیخنے چلانے کی آوازیں، وہ دونوں باہر کی طرف بھاگے۔

☆.....☆.....☆

آج جب میں معاذ کے ساتھ باہر گئی تھی تو ایک بد صورت بھکارن نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ مجھے ایسا کیوں محسوس ہوا جیسے وہ زہرا تھی۔ اس کے ہاتھ میں وہی چاندی کا چھلا تھا جو میں نے اسے دیا تھا۔ اگر وہ زہرا ہی تھی تو پھر وہ میت کس کی تھی، پھر اس کے چہرے کو کیا ہوا۔ میرے چہرے پر نقاب کے باوجود بھی اس نے مجھے کیسے پہچان لیا؟ شاید میری آنکھوں سے، اگر اس نے پہچان لیا تو کیا کبھی اور لوگ بھی مجھے پہچان لیں گے۔ مجھے تلاش

کر لیں گے؟ اُف میں جتنا سوچتی ہوں پاگل ہوتی جاتی ہوں۔ معاذ بھی مجھ سے کچھ الجھے الجھے رہنے لگے ہیں۔ میں ان کو کیسے سمجھاؤں کہ میں کس کیفیت سے گزر رہی ہوں۔ خالہ نے بھی ان کو میرے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ پتا نہیں وہ میرے بارے میں کیا کیا سوچتے ہوں گے۔ میں کیسے بتاؤں انھیں کہ میں یہاں تک کیسے پہنچی؟ پتا نہیں وہ میرے بارے میں سب کچھ جاننے کے بعد کیا کریں گے۔ اوہ خالہ! آپ نے مجھے کس مشکل میں ڈال دیا۔ میں بھی حیران تھی کہ کوئی اتنا اچھا کیسے ہو سکتا ہے کہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی ایسی لڑکی سے شادی کر لے۔ ایک گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی۔ مجھے یقین ہے جب معاذ کو میرے بارے میں پتا چلے گا تو وہ مجھے گھر سے نکال دیں گے۔ پھر میں کہاں جاؤں گی؟ کیا ٹھکانہ ہوگا میرا؟

اُف میرے اللہ!

میں توبہ کر چکی پھر یہ گناہ کے اثرات میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتے۔ کیوں سائے کی طرح میرے ساتھ چمٹ گئے ہیں؟ کیوں؟ شاید بندے کی اصل آزمائش توبہ کے بعد ہوتی ہے۔ اللہ مجھے آزما رہا ہے۔ مجھے صبر کرنا چاہیے۔ گناہ کے اثرات میرا پیچھا کریں گے۔ مجھے ثابت قدم رہنا ہوگا۔ میرے پایہ استقلال میں لغزش نہیں آنی چاہیے۔ مجھے حوصلہ نہیں ہارنا چاہیے۔ مجھے یقین رکھنا چاہیے کہ اللہ میرے ساتھ ہے۔ وہ مجھے تنہا نہیں چھوڑے گا۔ اللہ... میرے اللہ!

☆.....☆.....☆

”اس رات کے بعد میں نے مالکوں سے صاف کہہ دیا تھا کہ میں آئندہ ڈرائیوری نہیں کروں گا بہانہ بنا دیا کہ میری کمر میں تکلیف ہو گئی ہے ڈاکٹر نے گاڑی چلانے سے منع کر دیا ہے، مجھے حویلی میں ملازموں کی نگرانی کے کام پر لگا دیا تھا انھوں نے۔ مجھے علم نہیں کہ بعد میں زہرابی بی سدر گئیں یا باہر جاتی رہیں لیکن ایک دن حویلی کی ملازمہ سے پتا چلا تھا کہ زہرابی بی کو باہر کہیں کسی کے ساتھ دیکھ لیا گیا تھا۔ بہت مارا تھا بڑے مالک نے اور کالج جانے پر پابندی لگا دی تھی۔ مجھے بہت دکھ ہوا لیکن شکر تھا کہ اللہ نے میری عزت رکھ لی تھی میری ملازمت کے دنوں میں مالکوں کو کسی بات کی بھٹک نہیں پڑی۔ نبی پاک ﷺ نے فرمایا ہے کہ مومن ایک سوراخ سے دوبار

نہیں ڈسا جاتا۔ لیکن میں شاید سچا مومن نہیں تھا۔ میں ایک ہی سوراخ سے اتنی بار ڈسا گیا اور بار بار لپک کر وہیں گیا۔ ہر بار قدرت نے مجھے بچایا لیکن مجھے عقل نہیں آئی۔ ہمارے جذبے بیمار ہیں مریم بی بی! ہم قدرت کے اشاروں کو سمجھ نہیں سکتے۔ میں سچ کہوں آپ مجھے کبھی بھی اچھی نہیں لگی تھیں۔ میں آپ کو بہت برا سمجھتا تھا لیکن آج آپ مجھے اپنے آپ سے زیادہ اچھی لگی ہیں۔ اس رات آپ نے توبہ کی اور سب چھوڑ دیا۔ دوبارہ غلطی نہیں کی۔ میں نے بھی اس رات توبہ کی تھی کہ آئندہ کسی بھی کام میں زہرا بی بی کا ساتھ نہیں دوں گا۔ اسی لیے ڈرائیوری بھی چھوڑ دی لیکن....“ مریم اس کی باتیں بہت غور سے سن رہی تھی۔ کرم دین چپ کر گیا پھر چند لمحے یوں ہی خاموشی سے آگے سرک گئے اور وہ پھر سے گویا ہوا۔

”لیکن میں ایک بار پھر زہرا بی بی کی باتوں میں آ گیا۔ ایک دن ملازمہ نے آکر مجھے پیغام دیا تھا کہ زہرا بی بی بلا رہی ہیں۔ مجھے نہیں جانا چاہیے تھا لیکن مقدر کی خرابی مجھے وہاں لے گئی۔ زہرا بی بی کی آنکھیں رونے کی وجہ سے سو جی ہوئی تھیں ان کے چہرے پر تھپڑوں کے نشان بھی تھے شاید انھیں بہت مارا گیا تھا۔ میں ایک بار پھر ان کے جال میں پھنس گیا... میں اسی سوراخ سے ایک بار پھر ڈسا گیا۔“ اس کی نگاہیں خلا میں کچھ تلاش کر رہی تھیں اور خلا میں زہرا کی سو جی آنکھوں اور چہرے والی شبیہ بننا شروع ہو گئی۔

”بابا نے مجھے بہت مارا ہے کرم دین! یہ دیکھو... دیکھو میرا چہرہ... کتنا مارا ہے بابا نے۔“

”معاف کیجیے گا زہرا بی بی لیکن برے کاموں کا انجام برا ہوتا ہے۔ تھرل یا ایڈونچر کے لیے ہی سہی لیکن آپ حد سے گزر گئی تھیں۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو کرم دین... میں واقعی بہت بری ہوں... لیکن میرے ساتھ ایسا سلوک کرنا چاہیے تھا ان کو؟۔“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں جی... میرے ہاتھ میں بھلا کیا ہے؟۔“

”کرم دین! تم بہت اچھے ہو کرم دین... تم نے میری بہت بار مدد کی تھی۔ ایک بار اور میری مدد کر دو... پلیز۔“ وہ ملتی لپچے میں گویا ہوئی۔

”نہیں بی بی اب میں آپ کی کوئی مدد نہیں کروں گا... مجھے پہلے ہی افسوس ہے کہ میں نے آپ کا اتنا ساتھ

کیوں دیا۔“

”تمھاری اچھائی تھی کرم دین... میں کبھی بھی تمھارے احسان کا بدلہ نہیں چکا سکوں گی۔ تمہیں پتا ہے دودن بعد بابا جان میرا نکاح چا چا غلام نبی کے پاگل بیٹے سے کر رہے ہیں، پھر میں ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلی جاؤں گی۔ گھر میں قید ہو کر رہ جاؤں گی۔ تم بس ایک بار میری مدد کر دو۔ مجھے گنج بخش جھویری کے دربار لے جاؤ۔ میں نے منت مانی تھی۔ چادر چڑھانی ہے، وہاں کے فقیروں کو کھانا کھلانا ہے۔ تم مجھے وہاں لے جاؤ بس۔“

”میں کیسے لے جاؤں بی بی... اب میں آپ کا ڈرائیور نہیں رہا... میں نے یہ کام چھوڑ دیا ہے۔“

”میں جانتی ہوں... لیکن مجھے اور کسی پر اعتبار نہیں ہے۔ تم ہی مجھے سب سے چھپا کر لے جاسکتے ہو۔“

”آپ کسی بری نیت سے جانا نہیں چاہتیں تو بڑے مالک آپ کو نہیں روکیں گے۔ آپ ان کی اجازت کے بنامت جائیں اور اگر وہ منع کریں تو کسی اور سے کہہ دیں منت پوری کرنے کے لیے....“

”نہیں منت میں نے مانی تھی، میں خود پوری کروں گی۔“ اس نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

”میں کسی طرح بھی ان کی بات ماننے کو تیار نہیں تھا لیکن وہ میرے سامنے ہاتھ جوڑنے لگیں، رونے اور گڑ گڑانے لگیں۔ میں مان گیا، میری قسمت کا کھوٹ تھا مجھے ماننا پڑا۔ زہرا بی بی وہیں سے غائب ہو گئیں۔ ایک لمحے کی چوک ہوئی تھی مجھ سے۔ میں پاگلوں کی طرح انھیں تلاش کرتا رہا لیکن وہ نہیں ملیں۔“

”شاید میں اندازہ کر سکتی ہوں کہ وہ کہاں گئی ہوگی۔“ مریم نے کہا

”کہاں؟ آپ مجھے بتا دیں... کوئی پتا، کوئی نشان۔“

”دیکھو مجھے یقین نہیں ہے لیکن مجھے لگتا ہے وہ احسن زمان کے پاس گئی ہوگی۔ اس کی احسن سے کافی دوستی تھی۔“

”اس کا کوئی پتا ٹھکانہ معلوم ہے آپ کو؟۔“

”وہ فارم ہاؤس جہاں ہم گئے تھے اسی کا ہے لیکن وہ وہاں رہتا نہیں ہے ادھر لاہور میں ہی کہیں رہتا ہے۔ میری پرانی سم میں اس کا نمبر ہے میں ابھی لاتی ہوں۔“ مریم چلی گئی۔ وہ کچھ دیر بعد واپس آئی تو اس کے ساتھ ایک بوڑھی عورت بھی تھی۔

”یہ میری امی ہیں۔“ مریم نے تعارف کروایا۔

”السلام علیکم جی!“ کرم دین نے کھڑے ہو کر سلام کیا اور مریم کی والدہ نے اس کے سر پر پیار دیا۔

”ارے بیٹھو بیٹا! مریم نے مجھے بتایا ہے کہ زہرا کہیں کھو گئی ہے۔“

”جی ماں جی... بس دعا کریں وہ مل جائیں۔“

”اللہ اسے جلد ملا دے۔ بے چارے ماں باپ کا پتا نہیں کیا حال ہوتا ہوگا۔“

”بس ماں جی آپ دعا کیجیے گا۔“ وہ بس اتنا ہی کہہ پایا۔

”ہاں بیٹا! یہ کوئی کہنے کی بات ہے۔ میرا تو دل ہی ہول گیا... جوان بچی... کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو کیا ہوگا۔ اللہ

سب خیر کرے۔“ وہ چپ رہا۔

”یہ لو میں نے نمبر اس کا غڈ پر لکھ دیا ہے۔“

”بہت شکریہ جی۔ اگر آپ کو کچھ اور پتا چلا تو مجھے اس نمبر پر پیغام دے دیجیے گا۔ سمجھیں یہ نمبر میرے بھائی

کا ہے۔“ کرم دین نے مریم کو نمبر لکھوایا۔

”اب اجازت؟“ وہ کھڑا ہوا۔

”ارے نہیں بیٹا کھانا کھا کر جانا... میں ابھی بھجواتی ہوں۔“ مریم کی امی اسے کھڑے ہوتے دیکھ کر بولیں۔

”نہیں ماں جی... بہت شکریہ... کافی دیر ہو چکی ہے۔ مجھے چلنا چاہیے۔“

”کھانا تیار ہے بالکل... یوں جانا اچھا نہیں لگتا۔“

”پھر کبھی سہی... مجھے ابھی کسی ضروری کام سے جانا ہے۔“

”اچھا... زہرا کی کوئی خبر ملے تو ضرور بتانا۔“

”جی ضرور۔“

مریم اسے دروازے تک چھوڑنے آئی۔

”کرم!“ وہ دروازے سے نکلا تو مریم نے اسے پکارا:

”جی۔“

”پھر کبھی آؤ گے؟“

”پتا نہیں... قسمت لائے گی تو شاید۔“

”میں انتظار کروں گی۔“ وہ مسکرا کر رہ گیا اور مریم اسے نظروں سے اوجھل ہونے تک دیکھتی رہی۔

☆.....☆.....☆

”خالہ جی کی پارٹی کے جلسے میں فائرنگ ہوئی ہے اور بھکڈ رنج گئی۔ خالہ جی اور دلاور بھائی صاحب بھی زخمی ہو گئے ہیں۔ انھیں اسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔ میں ادھر ہی جا رہا ہوں۔“ فضیل اور امینہ باہر آئے تو یہ اطلاع منتظر تھی۔ ساتھ والے گھر سے لڑکائیہ خبر دینے آیا تھا۔ شبانہ اور بچے اس اطلاع پر چیخ چلا رہے تھے۔

”چلو میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔“

”میں بھی جاؤں گی ساتھ۔“ روتے ہوئے شبانہ بولی۔

”نہیں بھابھی آپ ادھر ہی رکیں وہاں پہنچ کر میں آپ کو اطلاع کرتا ہوں۔ امینہ بھابھی آپ شبانہ بھابھی کو سنبھالیں اور صوفیہ بھابھی پلیرز آپ سبحان بھائی سے کہیں کہ وہ جلدی اسپتال پہنچیں۔“ وہ سب کو ہدایات دیتے ہوئے لڑکے کے ساتھ باہر نکل گیا۔

بھکڈ ر میں کافی لوگ زخمی ہوئے تھے۔ اسپتال پہنچتے ہی انھیں دلاور بھائی دکھائی دے گئے ان کے ماتھے اور بازو پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ”اماں کدھر ہیں بھائی!“ فضیل دلاور کو دیکھتے ہی اس کی طرف بڑھا۔

”ان کی حالت زیادہ اچھی نہیں ہے۔ وہ ادھر ایمر جنسی میں ہیں ابھی۔“

”اوہ... ہوا کیا تھا؟“

”بس اچانک ہی جلسے میں لڑائی چھڑ گئی۔ پہلے ہجوم پر پتھر پھینکے، فائرنگ ہوئی اور پھر بھکڈ ر رنج گئی۔ کچھ سمجھنے کا وقت ہی نہیں ملا۔ اماں کو گولی بھی لگی ہے۔ وہ اسٹیج پر تھیں۔“

”اوہ... چلو چلتے ہیں... ان کے پاس۔“

”نہیں انھیں خون کی ضرورت ہے میں اسی لیے نکلا ہوں۔ میرا بلڈ گروپ میچ نہیں ہو رہا۔“

”میرا خیال ہے میرے یا سبحان بھائی میں سے کسی کا میچ ہو جائے گا۔ آئیے میں اپنا چیک کرواتا ہوں“



، بھائی سبحان بھی آرہے ہیں۔ میں اطلاع کرنے کا کہہ آیا تھا۔“  
”چلو جلدی چلیں پھر۔“

وہ دونوں تیزی سے ایمر جنسی وارڈ کی طرف بڑھے۔ عذرا جہاں بے ہوش تھیں۔ ٹانگ اور ماتھے سے بہت خون بہ رہا تھا۔ چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ ماں کی حالت دیکھ کر فضیل کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ اپنی ماں سے خوب لڑنا چاہتا تھا لیکن قدرت نے اس کا موقع نہیں دیا تھا۔ اس نے بے اختیار توبہ کی کہ اگر کوئی بول اس کی ماں کی پکڑ کا باعث بنا ہے تو اللہ اسے معاف کر دے۔ اسے ماں سے گلے ضرور تھے لیکن وہ انھیں اس حالت میں دیکھ نہیں پارہا تھا۔ ماں کو خون دیتے ہوئے اس نے بے اختیار اپنی ماں کی زندگی کی دعا کی تھی۔ اس لمحے اسے فجر ارمغان پر ہونے والے مظالم کا خیال تک نہیں آیا تھا۔ زندگی کا دستور ہے۔ خون کے رشتے محبت کے رشتوں سے کہیں بڑھ کر ہوتے ہیں۔



ایک لڑکی کا گھر سے بھاگنا قبیح ترین فعل ہے۔ ایسا عمل جیسے معاشرہ کبھی معاف نہیں کرتا۔ مجھے شاید اس بات کا اندازہ تک نہیں تھا۔ عقل پر پردے پڑے ہوں تو انسان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب ہو جاتی ہے۔ زہرا کے انتقال کو دو ماہ کا عرصہ گزر گیا تو ابوجان نے امی جان سے میرے شیردل کے ساتھ نکاح کا ذکر چھیڑ دیا۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ میں نے باورچی خانے میں چائے پلاتے ہوئے ٹی وی لاؤنج میں ہونے والی بات چیت سن لی تھی۔

”پیر و مرشد نے فجر اور شیردل کے نکاح کی بات کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ گھر میں موت ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا اس لیے سادگی سے نکاح کر دیا جائے گا۔“

”اوہو... آپ بھی کمال کرتے ہیں... آپ نے ابھی تک پیر صاحب کو بتایا نہیں کہ ماں جی نے بچپن میں فجر کی بات فرمان بھائی کے مانی کے ساتھ طے کر دی تھی۔“

”میں نے بات کی تھی پیر صاحب سے.. انھوں نے کہا تھا کہ اس طرح بچپن میں طے کیے ہوئے رشتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ ویسے بھی پیر صاحب کے خاندان کے ساتھ رشتے داری ہونا ہمارے لیے بڑے فخر کی

بات ہے۔“

”وہ سب ٹھیک ہے لیکن ماں جی کی روح کو کتنی تکلیف ہوگی۔ آپ کو پتا ہے انھیں فجر سے کتنا پیار تھا۔ کتنا زیور جمع کر کے انھوں نے مجھے دیا تھا کہ یہ فجر اور مانی کی شادی پر چڑھا دینا۔ وہ ننھی سی انگوٹھی ابھی میرے پاس ہے جو فرمان بھائی اور بھابھی نے ان کی منگنی پر پہنائی تھی۔ سنیے جی! میرا دل نہیں مانتا۔ آپ ایک بار دوبارہ پیر صاحب سے بات کریں اس بارے میں۔“

”دماغ ٹھیک ہے تمہارا... عجیب باتیں کرتی ہو تم... میں پیر صاحب سے بحث کر کے اپنی آخرت خراب نہیں کرنا چاہتا۔ اور ماں وہ میری تھی۔ تمہیں اتنی کیا مصیبت پڑی ہے ان کی وصیت پوری کرنے کی۔ جب میں نہیں چاہتا تو تمہیں بھی اس بارے میں ہلکان ہونے کی ضرورت نہیں۔“

”ٹھیک ہے جی وہ آپ کی ماں تھیں لیکن میرے لیے بھی وہ ماں سے بڑھ کر تھیں۔ انھوں نے کبھی اپنی بہوؤں کو بیٹیوں سے کم نہیں سمجھا۔ میرا دل نہیں مانتا... ویسے بھی شیردل سے ہماری فجر کا کوئی جوڑ نہیں... کم از کم دگنی عمر کا ہے وہ فجر سے.....“ امی کی بات پر ابو نے امی کو زوردار تھپڑ مارا۔ میں اندر کچن میں کھڑی کانپ گئی۔ ابو نجانے کیا کچھ کہہ رہے تھے۔ امی بھی آگے سے پورے پورے جواب دے رہی تھیں لیکن مجھے یقین ہو گیا تھا کہ امی یہ جنگ کبھی نہیں جیت سکیں گی۔ ابو میری شادی شیردل سے کر کے رہیں گے۔ میرے اندر بغاوت کا لاوا اس حد تک پک چکا تھا کہ بس کسی بھی وقت ابل کے باہر آنے کو بے قرار تھا۔ ابو اپنا غصہ اتار کر باہر چلے گئے۔ امی سو بے چہرے اور آنکھوں کے ساتھ کچن میں آئیں انھوں نے مجھے گلے لگایا:

”میں اپنی بچی پر یہ ظلم کبھی نہیں ہونے دوں گی۔ دیکھنا میری لاش پر ہی یہ رشتہ طے ہوگا۔“ امی نے اس دن مجھے خوب پیار کیا۔ گلے لگایا لیکن میرے اندر سارے جذبے سرد پڑ چکے تھے۔ امی کا محبت بھرا لمس بھی مجھے میرے ارادوں سے باز نہیں رکھ سکا۔ اُسی روز میں نے فیصل سے دو ٹوک بات کی:

”تم کتنی محبت کرتے ہو مجھ سے؟“

”اپنی جان سے بھی زیادہ۔“

”سچ کہتے ہو؟“

”دل چیر کے دکھا دوں کیا؟“

”دیکھو فضیل! ابو نے میری شادی طے کر دی ہے۔“

”کیا... یہ کیا کہہ رہی ہو؟ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تم... تم انکار کر دو۔“

”انکار کرنا آسان نہیں۔ امی نے منع کیا تھا تو ابو نے انھیں بہت مارا ہے۔ مجھ میں مار کھانے کا حوصلہ نہیں ہے فضیل! مجھے مار سے بہت ڈر لگتا ہے۔“ میری آواز بھرا گئی تھی۔

”پھر... پھر کیا کرو گی؟“ اس نے بے قراری سے پوچھا۔

”اگر میں گھر سے بھاگ آؤں تو تم مجھے کہاں رکھو گے؟“

”اپنے دل میں... اپنی پلکوں پر۔“ ہمیشہ کی طرح ایک جذباتی جملہ آیا اور میں نہال ہو گئی۔

”بس پھر میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اب میں یہاں نہیں رہوں گی۔“

”کیا مطلب؟“

”دو دن بعد کالج میں ٹرپ ہے... ہم ہیڈ بلوکی جا رہے ہیں۔ میں وہاں سے تمہارے ساتھ چلی جاؤں گی۔ تم انتظام کر لینا۔“ دوسری طرف خاموشی تھی۔

”ہیلو...؟؟؟“ میں نے کوئی جواب نہ پا کر کہا۔

”فجر تمہیں نہیں لگتا یہ جلد بازی ہو گی؟“

”جلد بازی؟ ٹھیک ہے پھر میری شادی ہونے کا انتظار کرو تم۔“ مجھے اس پر بے حد غصہ آ رہا تھا۔

”یہ نہیں ہو سکتا۔“

”یہ ہو کر رہے گا اور تم کچھ نہیں کر سکو گے۔ تم بس باتیں ہی کر سکتے ہو فضیل۔ کچھ کرنے کا حوصلہ نہیں ہے تم میں۔“

”یہ کیسے کہہ سکتی ہو تم... بات یہ ہے کہ ابھی میرا زلٹ نہیں آیا۔ نوکری نہیں ملی۔ میں کیسے اماں سے تمہارے بارے میں بات کروں۔ وہ کبھی بھی راضی نہیں ہوں گی۔“

”ہاں مجھ سے محبت کے دعوے تم نے اپنی اماں سے پوچھ کر کیے تھے ناں... تم تو میرے دامن کو چاند تاروں

سے بھرنے کی بات کرتے ہو۔ مجھے انگاروں میں جلتا دیکھ پاؤ گے؟“ وہ لمحہ بھر کے لیے پھر خاموش ہو گیا۔  
 ”فضیل ہمارے پاس سوچنے کے لیے صرف کل تک کا وقت ہے۔ پرسوں تک ہمیں کسی نتیجے تک پہنچنا ہے۔ اگر تم مجھے قبول کر لو گے ٹھیک ہے ورنہ ہیڈ بلوکی کے پانی میں کود کر میں اپنی جان دے دوں گی۔ پرسوں واپس گھر آنا مجھے قبول نہیں۔ فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔“

”نہیں فجر تم ایسا کچھ نہیں کرو گی۔ دیکھو اگر میں تمہیں اپنے گھر لے آؤں گا تو تمہارے لیے زندگی آسان نہیں ہو گی۔ میری اماں بہت سخت مزاج کی ہیں۔ میں چاہتا تھا کہ نوکری مل جائے تو ہم اپنی نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔ کچھ بھی ہے تم نے زندگی کی سختیاں نہیں دیکھیں، ہمارے گھر کی زندگی آسان نہیں ہے۔“  
 ”میں مرنے کا فیصلہ کر چکی ہوں فضیل! تمہارے گھر کی زندگی موت سے مشکل تو نہیں ہو سکتی؟“ میرا لہجہ قطعی تھا۔

”ٹھیک ہے جب تم سختیاں جھیلنے کے لیے تیار ہو تو مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں۔“  
 اگلے دن کالج میں میں نے اس بارے میں عالیہ تنویر سے بات کی۔ عالیہ میری بات سن کر حیران رہ گئی تھی۔ وہ مجھے ایسے دیکھ رہی تھی جیسے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔  
 ”ایسے مت دیکھو میری طرف عالیہ۔“  
 ”تم پاگل ہو گئی ہو فجر... یہ صرف پاگل پن ہے۔“  
 ”ہاں یہ پاگل پن ہے لیکن میرے باپ کو اس بات کا خیال تک نہیں کہ وہ میرے ساتھ کیا کر رہا ہے تو مجھے بھی اس کی پروا نہیں کہ ان کو لوگ کیا کہیں گے۔“  
 ”دیکھو تمہاری امی تمہارے لیے اسٹینڈ لے تو رہی ہیں۔“

”امی کچھ نہیں کر سکیں گی۔“  
 ”تم چند دن صبر کر کے دیکھو تو سہی۔ انہوں نے کہا ہے ناں کہ وہ ایسا نہیں ہونے دیں گی۔“  
 ”کیا کر لیں گی وہ... ہمیشہ کی طرح رو دھو کر مجھے صبر کرنے کی تلقین کریں گی۔ مجھ میں صبر نہیں ہے۔ یا تو میں مرجاؤں گی یا پھر میں اپنی زندگی کا ایک رسک لوں گی اور میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں ایک رسک لوں گی۔ میں

فضیل کو آزمایا چکی ہوں۔ مجھے اندازہ ہے کہ وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔“

”پاگل لڑکی! زندگی صرف محبت کے سہارے نہیں گزرتی۔ اس کے کچھ اور تقاضے بھی ہوتے ہیں اور محبت ان تقاضوں میں سب سے آخری نمبر پر آتی ہے۔ پیٹ میں روٹی اور سر چھپانے کو ٹھکانہ نہ ہو تو محبت کے الفاظ اپنی اہمیت کھودیتے ہیں۔ تمہیں اپنے فیصلے پر پچھتانا پڑے گا۔“

”ٹھیک ہے جب پچھتانا ہی مقدر ہے تو میں اپنی مرضی کا فیصلہ کر کے پچھتانا چاہوں گی۔ ساری عمر اس پچھتاوے کے ساتھ نہیں رہوں گی کہ میں نے ایک رسک کیوں نہ لیا۔“

”تم اتنی بہادر تو نہیں تھیں فجر!“

”جب معاملہ بٹاکا ہو انسان بہادر ہو جاتا ہے۔“

”تم بٹاکے نہیں فنا کے راستے پر چل رہی ہو۔“

”مجھے قبول ہے۔“

”اپنی زندگی کے ساتھ آخرت بھی خراب کر رہی ہو۔“

”میرے ابو جیسی باتیں نہ کرو پلیز... میں نے ساری عمر کچھ نہ کر کے بھی آخرت خراب ہونے کے طعنے سنے ہیں۔ اب مجھے اپنی زندگی کی پروا ہے۔ بس زندگی کی۔“ میری آنکھوں سے شعلے ابل رہے تھے۔ عالیہ بس مجھے دیکھ کر رہ گئی۔ میری حالت اس کہاوت سے مختلف نہ تھی۔ سیکھ نہ دیجیے ماندر ا جو گھر بے کا جائے، سیکھ واکو دیجیے جا کو سیکھ سہائے۔

”مجھے ناصح کی نہیں... دوست کی ضرورت ہے عالیہ... پلیز... پلیز میری مدد کرو۔“

”اللہ انسان سے بہتر فیصلے کرتا ہے فجر! تم ڈوری اپنے اللہ پر چھوڑ دو... وہ تمہارے لیے بہتر فیصلہ کرے گا۔“

”عالیہ میں نے ساری زندگی اللہ کے فیصلے دیکھے ہیں۔ اللہ صرف پیر صاحب جیسے لوگوں کی سنتا ہے۔ میری تمہاری نہیں۔ مجھے اپنے فیصلے پر پچھتانا پڑا تب بھی مجھے سکون رہے گا کہ یہ میرا اپنا انتخاب ہے۔“ عالیہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔

”مجھے کیا کرنا ہے؟“ اس نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔

”کل جب ہم ہیڈ بلوکی جائیں گے تو میں فضیل کے ساتھ چلی جاؤں گی۔ تم ٹیچرز سے کہہ دینا کہ میں پانی میں گر گئی ہوں۔“

”کیا... یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“ اس کا رنگ فق تھا۔ میں نظریں چرا گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

”اگر فضیل کل نہ آیا تو؟“ عالیہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”تو پانی میں سے میری لاش مل جائے گی سب کو۔“ میں نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔

”مرنا آسان نہیں ہوتا؟“

”میرے لیے وہ زندگی جینا بھی آسان نہیں جس کا انتخاب ابو نے کیا ہے۔“

”اپنی امی کا سوچو۔“

”سوچ چکی... اسی لیے کہتی ہوں میں فضیل کے ساتھ جاؤں یا نہ جاؤں... دونوں صورتوں میں میری موت

کی خبر ملے گی امی کو۔ رو دھو کے صبر آ جائے گا انھیں... میں انھیں انتظار کا دکھ نہیں دینا چاہتی۔“

عالیہ چپ تھی۔ اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ میرے آنسو خشک ہو چکے تھے۔ میں ایسی نہیں تھی۔ میں ایسی کب اور کیسے ہو گئی مجھے پتا بھی نہ چلا۔ اتنی خود غرضی مجھ میں کب آئی مجھے احساس تک نہیں ہوا۔ خون میں حرام شامل ہو جائے تو جذبے کمزور پڑ جاتے ہیں۔ میرے لہو میں بھی میرے ابو کے کھلائے حرام کے لقمے اپنا اثر دکھا رہے تھے پھر بھلا میں خود غرض کیوں نہ ہوتی۔ مجھے خود غرض ہونا ہی تھا۔ یہی میرا مقدر تھا۔

☆.....☆.....☆

احسن زمان سے بات کرنا اور اس سے ملنا کرم دین کے لیے اتنا آسان نہیں تھا۔ اس سلسلے میں بھی مریم نے اس کی مدد کی تھی۔ احسن زمان نہ کرم دین سے بات کرنے کو تیار تھا، نہ ہی اس سے ملنے کو۔ آخر مریم نے اپنی باتوں کا جال پھیلا کر احسن زمان کو ایک ویران جگہ پر ملنے کے لیے بلایا جہاں مریم کی جگہ کرم دین پہنچا ہوا تھا۔ کرم دین احسن زمان کے مقابلے میں تنومند تھا۔ اس نے احسن زمان کو قابو کر کے ایک رسی کے ساتھ اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے:





”پتا نہیں... میں نے اسے کہا تھا اپنا انتظام کر لے۔“  
 ”جھوٹ بولتے ہو۔“ کرم دین نے چھری اس کی طرف بڑھائی۔  
 ”نہیں.... بالکل سچ... میں اسے ہمیشہ کے لیے کیسے رکھ سکتا تھا؟“  
 ”حد ہے.... کہاں گئی وہ؟“

”میں سچ کہتا ہوں میں نے اسے دس ہزار روپے دیے تھے اور بس اسٹاپ کے پاس چھوڑ دیا تھا۔“  
 ”کون سا بس اسٹاپ؟“ احسن زمان نے جگہ بتائی۔ کرم دین نے اسے زور سے تھپڑ مارا۔ یعنی تین دن پہلے تک وہ اس کے پاس تھی۔ کرم دین کو افسوس ہوا اگر مالکوں نے اسے باندھ کر نہ رکھا ہوتا تو وہ زہرا بی بی تک پہنچ سکتا تھا۔ اگر وہ لاہور آتے ہی اس کی تلاش شروع کر دیتا تب بھی وہ اسے مل جاتی۔ کرم دین نے اس کی رسیاں کھول دیں۔ احسن زمان بنا کسی تاخیر کے گاڑی بھاگ کر لے گیا۔ گاڑی کی اڑتی دھول میں کرم دین کف افسوس ملتا رہ گیا۔

☆.....☆.....☆

”تم فکر مت کرو فجر میں نے سب انتظام کر لیا ہے۔ میرا دوست نکاح خواں اور گواہوں کا انتظام کر لے گا۔ ہم اسی دن نکاح کر لیں گے۔“ فضیل نے مجھے یقین دہانی کروائی تھی۔ یہ میرے گھر چھوڑنے سے ایک رات پہلے کی بات تھی۔ میں فضیل سے ٹیکسٹنگ کر رہی تھی کہ امی نے دروازہ کھولا میں نے فون سرہانے کے نیچے چھپا لیا۔

”تم ابھی سوئی نہیں؟“  
 ”نہیں امی بس سو رہی ہوں۔“

”سو جاؤ میری بچی... تم فکر مت کرو۔ میں نے مانی کی خالہ سے بات کی ہے... کل میں ان سے جا کر ملوں گی۔ اگر تمہارے ابو نہ مانے تو بھی میں تمہارا نکاح مانی سے کروادوں گی۔ تم ایک بار یہاں سے چلی جاؤ پھر میرے ساتھ یہاں جو بھی سلوک ہو مجھے پروا نہیں۔“ مجھے بے اختیار اپنی امی پر بے حد پیار آیا۔ میں ان کے گلے لگ کر خوب روئی۔

”نہیں امی... میں آپ کو ایسی تکلیف نہیں دینا چاہتی۔“

”نہ بیٹا... تکلیف کی کیا بات ہے... تم خوش ہوگی ناں تو کوئی تکلیف میرے لیے تکلیف نہیں ہوگی۔“

میری امی!... ان کا آخری لمس..... آہ..... مجھے نہیں پتا تھا میں اپنی امی کی قاتل بن جاؤں گی۔ میری موت کی خبر ان کی موت کا باعث بن گئی۔ اپنی جنت میں نے اپنے ہاتھوں سے اُجاڑ لی۔ کتنی بد بخت ہوں میں۔ سوچا بھی نہیں کہ وہ کیسے یہ غم برداشت کریں گی۔ مجھے لگتا تھا کچھ رو دھو کر انھیں صبر آ جائے گا۔ انسان کو جو لگتا ہے ہمیشہ وہ نہیں ہوتا۔ انسان جو سوچتا ہے وہ بھی کبھی نہیں ہوتا۔ فضیل مجھے اپنے ساتھ لے آیا تھا لیکن اس کا دوست نکاح خواں اور گواہوں کا انتظام نہ کر سکا کیونکہ اس کے والد کی طبیعت خراب ہو گئی تھی اور وہ انھیں لے کر اسپتال چلا گیا تھا۔ فضیل سے نکاح میرے مقدر میں نہیں تھا۔ وہ مجھے بنا نکاح کے اپنے گھر لے گیا اور گھر والوں کے سامنے بیوی بنا کر پیش کر دیا۔

فضیل کا گھر.... زندگی میں جہنم کی جھلک۔ اُف... فضیل کی امی عذرا جہاں اتنی ظالم..... آج بھی وہ دن یاد کروں تو رو ٹگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مجھے مار سے ڈر لگتا تھا۔ قسمت نے مجھے ایسے مقام پر لا کھڑا کیا تھا جہاں اتنے نوالے نہیں کھائے جتنی مار کھائی۔ فضیل اپنی آنکھوں سے مجھ پر ہونے والے ظلم دیکھتا تھا لیکن کچھ نہیں کہتا تھا۔ عذرا جہاں معمولی غلطی پر گرم چمچے سے میرا ہاتھ جلادیتیں۔ میں صبر کر جاتی۔ پلاسٹک کی پائپ سے میری پیٹھ پر وار کرتیں، میں آنسو پی کر رہ جاتی۔ جس روز وہ مجھے فضیل سے بات کرتا دیکھ لیتیں اسی روز کسی نہ کسی بہانے مجھے ان کے عتاب کا نشانہ بنا پڑتا۔ پورے گھر کے کام، بار اور کھانے کے نام پر چند سوکھے نوالے۔ یہ زندگی میرا انتخاب تھی۔ یہ جہنم میری اپنی دہکائی ہوئی تھی سو بصد خوشی جلنا مجھے قبول تھا۔ میں نے عالیہ سے کہا تھا کہ میں صبر نہیں کر سکتی لیکن صبر کیا ہوتا ہے، ضبط کسے کہتے ہیں، یہ میں نے فضیل کے گھر میں گزارے ڈیڑھ مہینے میں سیکھ لیا تھا۔ یہ وہ راہ تھی جو میں نے چنی تھی۔ ہر گزرتے پل کے ساتھ میں بچھتا رہی تھی لیکن اب فریاد بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اللہ تب بھی مجھے یاد نہیں آیا تھا حالانکہ مجھے اللہ یاد آنا چاہیے تھا۔ میں خاموش ہر ظلم سہتے ہوئے فضیل کو دیکھتی کہ اس کی محبت کب اپنا جوش دکھائے گی، اس کے دعوے کب سچ ہوں گے۔ اسے دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس نے مجھے کوئی چیز سمجھا ہے جسے اپنے گھر کے کونے میں رکھ کر وہ بھول گیا ہو۔ کبھی کبھار میں

یاد آتی تو وہی خوابوں خیالوں کی باتیں کرنے لگتا۔ اب تو اس کا لہجہ بھی اس کے الفاظ کا ساتھ نہیں دیتا تھا پھر وہ مجھے اسی جہنم میں چھوڑ کر دہی چلا گیا۔ مجھے کتنی دیر یقین نہیں آیا کہ وہ مجھے چھوڑ کر جا چکا ہے۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میں تپتی ریت میں بنا سائبان کے تنہا کھڑی ہوں۔ دور دور تک چھاؤں، نہ کوئی دیوار جس کے سہارے کھڑی ہو سکوں۔ فضیل کی محبت سراب تھی جس کے پیچھے بھاگتی بھاگتی میں تھک گئی اور جب تھک کر گر گئی تو احساس ہوا کہ دشت زیست میں میں پیاسی جسے تالاب سمجھ کر بھاگی تھی وہ سراب تھا۔ صرف سراب۔

☆.....☆.....☆

عذرا جہاں کی ٹانگ سے گولی نکال لی گئی لیکن ان کی ٹانگ بے کار ہو چکی تھی۔ ساری زندگی زمین پر مطراق سے چلنے والی عذرا جہاں وہیل چیئر کی محتاج ہو گئی تھیں۔ ان کی ساری اکڑفوں نکل گئی تھی۔ کل تک جن بہوؤں کو باندیاں سمجھا تھا آج معمولی کاموں کے لیے بھی انھیں آواز دینا پڑتی تھی۔ کبھی آواز سن لی جاتی، کبھی ان سنی کر دی جاتی۔ بچے جو کبھی دادی سے خوفزدہ تھے۔ آج اسے کسی کتنی میں نہ لاتے تھے۔ وقت سدا ایک سا نہیں رہتا۔ انسان کو سوچ لینا چاہیے کہ ظلم کی شہنی پھلتی نہیں، ناؤ کاغذ کی چلتی نہیں۔ صوفیہ جو سارا دن عذرا جہاں کے آگے پیچھے گھوما کرتی تھی۔ اب اوپر اپنے کمرے کی ہو کر رہ گئی تھی۔ شبانہ اور صوفیہ دونوں نے اپنا کچن اوپر سیٹ کر لیا تھا۔ امینہ میں کچھ خدا خوفی تھی وہ ساس کو پوچھ لیا کرتی۔ وقت کا پانسہ پلٹ چکا تھا۔ عذرا جہاں نے جو فصل بوئی تھی اس کے کاٹنے کا وقت آچکا تھا۔ دلا اور اور سبحان سرسری ماں کا حال پوچھ لیا کرتے۔ فضیل اکثر امینہ کے سر ہوتا کہ وہ اسے فجر کا پتا بتا دے۔ امینہ کئی کتر اجاتی۔ آخر ایک روز تنگ آ گئی:

”دیکھو فضیل اس کی شادی ہو چکی ہے اب اس کا خیال دل سے نکال دو۔“

”کیا؟... یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟۔“

”یہی سچ ہے۔ اب تمہیں یہ سچ تسلیم کر لینا چاہیے۔“

”نہیں میں نہیں مان سکتا۔ وہ ایسا کر ہی نہیں سکتی۔ آپ مجھے ایک بار اس کا پتا بتا دیں پلیز.. میں اپنی آنکھوں

سے دیکھ لوں گا تو شاید مجھے چھین پڑ جائے۔“

”ٹھیک ہے تمہاری مرضی... لیکن میرے خیال میں تمہیں اب اسے پریشان نہیں کرنا چاہیے۔“

”آپ نے اچھا نہیں کیا امینہ بھابھی۔“ وہ امینہ سے گلہ کرنے لگا۔

”ہاں میں نے اچھا نہیں کیا۔ تمھاری ماں اسے کسی کے ہاتھ بیچ دیتی تب بہت اچھا ہوتا۔“ امینہ اس کی طبیعت صاف کر کے اپنے کاموں میں لگ گئی۔ فضیل ہاتھ ملتا رہ گیا۔

☆.....☆.....☆

شیدے سے فون پر بات کر کے کرم دین کو چاچا کریم بخش کے بارے میں پتا چلا تو اس کا دل کانپ اٹھا۔ اس نے مولوی اللہ دتا کے بیٹے سے درخواست کی کہ وہ چاچا کریم بخش کو اس کے پاس لے آئے۔ کریم بخش عجیب دیوانوں کی سی حالت میں کرم دین کو ملا تھا۔ خاموش گھنٹوں بغیر کچھ کھائے پیے ایک ہی جگہ بیٹھا رہتا۔ بیٹھے بیٹھے رونے لگتا، کبھی خود سے باتیں کرنے لگتا، بے معنی اور بے سروپا باتیں۔ وہ نہ کسی کو پہچانتا تھا، نہ کسی سے بات کرتا تھا۔ کوئی سامنے کھانے کو کچھ رکھ دیتا تو کھا لیتا، ورنہ گھنٹوں ایک ہی جگہ بیٹھا دیواروں کو تکتا رہتا۔ کرم دین نے اس بوڑھے کی خدمت میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا کیونکہ اسی طرح وہ اس کے احسان کا بدلہ چکا سکتا تھا۔

کریم بخش جس حال میں اسے ملا تھا اور کرم دین پر کی گئی نیکی کے بدلے جو کچھ اس کے ساتھ کیا گیا تھا، کرم دین جیسا نیک دل انسان اس کی وجہ سے اپنے دل پر بے حد بوجھ محسوس کر رہا تھا۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ زہرا کی تلاش کا عمل بھی جاری تھا۔ ڈرائیوری کا کام ایسا تھا کہ سارا دن سڑکوں کی خاک چھاننی پڑتی لیکن اس کی آنکھیں مسلسل کسی کو تلاش کر رہی تھیں۔ اس واقعے کو پانچ، چھ ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ زندگی ایک مخصوص ڈھب پر چل رہی تھی۔ حویلی میں گزرا وقت خواب ہوتا جا رہا تھا۔ چاچا کریم بخش کی خدمت، ملازمت اور اپنی ادھوری تعلیم کی تکمیل اس کی زندگی کا محور بن چکے تھے۔ بظاہر وہ اپنے ماضی کو دفنا چکا تھا، نئی زندگی کے شب و روز اس کی شخصیت میں غیر محسوس طریقے سے تبدیلی لارہے تھے لیکن لاشعوری طور پر اس کی تلاش جاری تھی۔ اس کی نگاہیں کسی کھوج میں رہتیں۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ زہرا اسے مل بھی گئی تو کیا ہوگا۔ وہ اسے تلاش کیوں کر رہا تھا یہ بھی نہیں جانتا تھا۔ شاید ایک بار اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟

کچھ باتیں انسان کے لاشعور میں کا حصہ ہوتی ہیں۔ وہ بغیر سوچے سمجھے ان باتوں پر عمل

کرتا چلا جاتا ہے۔ شعور اور فہم کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ تا حال کرم دین بھی اس بات سے بے خبر تھا کہ اس کی نگاہیں زہرا کی تلاش میں کیوں ہیں۔



معاذ نے دانستاً خود کو بے حد مصروف کر لیا تھا۔ فجر اور اس کے درمیان اجنبیت کی عجیب سی دیوار کھنچ گئی تھی جسے گرانے کی اس نے کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ فجر روزاول سے خاموش تھی، اس کی یہ چپ توڑنے کی کوشش معاذ کیا کرتا تھا لیکن اس ایک ہی ہفتے میں دو تین دفعہ معاذ کو ایسا محسوس ہوا تھا جیسے وہ جان بوجھ کر اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ معاذ اس کے رویے کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ اسے لگتا تھا جیسے اسے زبردستی اس رشتے کے لیے مجبور کیا گیا ہے۔ جب سے معاذ نے اسے مخاطب کرنا کم کیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے بھی پروا نہیں کہ معاذ بات کرے یا نہ کرے۔ معاذ کو رزلٹ آنے کے بعد جاب مل گئی تھی لیکن اس نے ابھی تک ٹیوشنز نہیں چھوڑی تھیں کیونکہ ان بچوں کے ماں باپ کا اصرار تھا کہ سالانہ امتحان ہونے تک معاذ انھیں ٹیوشن دے۔ اس روٹین کی وجہ سے وہ بہت تھک جاتا تھا۔ صبح آٹھ بجے گھر سے نکلتا تو رات دس بجے واپسی ہوتی۔ جب وہ گھر آتا تو دروازہ کھولنے اور سلام کا جواب دینے کے بعد وہ کچن میں چلی جاتی۔ معاذ فریش ہو کر آتا تو ٹیبل پر کھانا پڑا ہوتا۔ وہ کھانا کھاتا تو اسے چائے مل جاتی۔ سب اس قدر میکا کی انداز میں ہو رہا ہوتا کہ نہ معاذ کو اسے مخاطب کرنے کی ضرورت پیش آتی اور نہ ہی وہ کوئی بات کرتی۔ معاذ جتنا سوچتا اتنا الجھتا جاتا تھا یعنی اگر وہ اس کے ساتھ بات چیت کا آغاز نہ کرتا تو اسے کوئی پروا نہ ہوتی۔ اکثر منفی سوچ کے بیج غلط فہمی کی معمولی سی ہوا کے ساتھ اڑتے ہوئے دل کی زمین پر آگرتے ہیں۔ دل میں کدورتوں کی نم مٹی مل جائے تو انھیں جڑ پکڑنے کا موقع مل جاتا ہے۔ چائے پینے کے بعد وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہتا جو اسے نظر انداز کرتے ہوئے بلا مقصد کچن اور کمرے کے چکر لگاتی رہتی اور یہ چکر اس وقت ختم ہوتے جب معاذ وہاں سے اُٹھ کر ٹی وی لاؤنج میں جا بیٹھتا۔ اس دوران میں وہ اندر جا کر اپنے تئیں سوچکی ہوتی۔ پچھلے چار دن سے یہ سلسلہ جاری تھا۔ وہ کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس کی انا اسے بات کرنے سے روکتی تھی وہ منتظر تھا کہ اس بار وہ کوئی بات کہے، بات کا آغاز ہی کرے۔ بات سے بات وہ خود نکال لے گا۔ اس رشتے کی اس کی نظر میں کیا اہمیت تھی، چار دنوں میں اسے

اندازہ ہو گیا تھا۔ عجیب سا احساس اس کے اندر پروان چڑھنے لگا تھا۔

”ٹھیک ہے اسے میری پروا نہیں تو میں بھی مرا نہیں جا رہا۔ کتنی دیر تک بات نہیں کرے گی۔“

یہی سوچتے ہوئے چار دن گزر گئے تھے لیکن دوسری طرف سے ہنوز خاموشی تھی یعنی اسے یہ پروا بھی نہیں تھی کہ اس کا شوہر چار دن سے اس سے بات نہیں کر رہا۔ ٹی وی پر ٹاک شو چل رہا تھا اور معاذ کا ذہن اپنی بوجھل زندگی میں الجھا ہوا تھا۔ خالہ نے مجھ سے کیا چھپایا ہے؟ ایسی کیا بات ہے جو خالہ کو مجھے بتانی چاہیے تھی اور یہ خود نہیں بتا رہی؟ خالہ کو واپس آ جانا چاہیے اب۔ میں انھی سے بات کروں گا۔ کتنی عجیب بات ہے... میں بھلا خالہ سے کیا بات کروں گا؟ کیا کہوں گا کہ یہ مجھے انور کرتی ہے۔ بات نہیں کرتی مجھ سے... کتنا عجیب لگتا ہے... اُف عجیب الجھن ہے اس الجھن کا کوئی سراہا تھ نہیں آتا...

ٹی وی پر ایک کے بعد ایک چینل چل رہا تھا۔ پتا نہیں کب ٹی وی دیکھتے ہوئے وہ صوفے پر سوچکا تھا۔ رات کے کسی پہر آنکھ کھلی تو خود پر کمبل کی گرمائش محسوس کرتے ہوئے اسے خیال آیا کہ وہ صوفے پر ہی سوچکا تھا تو یہ کمبل کس نے دیا؟ بے اختیار مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی یعنی کوئی اتنا بھی اس کی طرف سے غافل نہیں۔ کسی کو اس کی پروا ہے.. اس خیال نے اسے اندر تک سرشار کر دیا۔ کمبل میں منہ چھپائے وہ سوچ چکا تھا کہ چپ کی اس دیوار کو وہی صبح توڑے گا۔ کیا فرق پڑتا ہے۔

☆.....☆.....☆

آنکھوں میں پانی بھرے وہ ڈائری کے صفحے سیاہ کر رہی تھی۔ معاذ ابھی ابھی آفس گئے تھے۔ اس کے خدشے ایک بار پھر ریت کی دیوار ثابت ہوئے تھے۔ معاذ نے چار دن بعد اس سے مسکرا کر بات کی تھی اور اسے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اسے دوبارہ زندگی مل گئی ہے۔ خوف کے کالے بادل بنا برے سے چھٹ گئے تھے اور محبت کے آسمان پر مطلع صاف تھا۔ محبت کے دو بولوں کی تپش نے خوف سے لرزے وجود کو گرمادیا تھا۔ معاذ کے جاتے ہی اس نے دو نفل شکرانے کے ادا کیے اور اللہ سے دعا کی کہ وہ اسے مزید کسی آزمائش سے بچائے اور کاموں سے فارغ ہونے کے بعد ڈائری لے کر بیٹھ گئی۔

”خوف میں گزرے بہت سے دن اور راتوں میں ایک دن اور میری یادوں کے چلمن میں لرز رہا ہے۔ وہ

دن جب عذرا جہاں نے اپنی موجودگی میں مجھے فضیل کی کال سننے اور اس سے بات کرنے کے لیے مجبور کیا تھا اور اس دن فضیل کے منہ سے نکل گیا تھا کہ وہ جلد ہی واپس آ کر مجھ سے نکاح کرے گا۔ یہ الفاظ نہیں تھے بلکہ ہم تھا جو بیک وقت عذرا جہاں، صوفیہ اور میری سماعتوں پر پھوٹا تھا۔ یہ جاننے کے بعد مجھے یقین تھا کہ اب پھر سے مجھے عذرا جہاں کے عتاب کا شکار ہونا پڑے گا لیکن کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ عذرا جہاں نے مجھ سے فون پکڑ لیا تھا اور میں ایک نظر اس کے سپاٹ چہرے پر ڈال کر وہاں سے بھاگ گئی تھی۔ پلٹنے کا حوصلہ تھا، نہ یہ دیکھنے کی سکت کہ عذرا جہاں کا رد عمل کیا ہے؟ بس اتنا یاد ہے کہ میں کانپ رہی تھی۔ امینہ بھابی کے کمرے میں رکھی اپنی چار پائی پر خود کو سیٹے میں خوف کی شدت سے کانپ رہی تھی۔ عذرا جہاں نے مجھے جب بھی مارا تھا انجانے میں مارا تھا۔ یہ سوچنے کا وقت کبھی نہیں ملا تھا کہ اب مار پڑنے والی ہے۔ اب مجھے پورا یقین تھا کہ وہ مجھے ضرور مارے گی کیونکہ میں اس کے بیٹے کی بیوی نہیں تھی اور نجانے کتنے دنوں سے اس کے گھر میں روٹیاں توڑ رہی تھی۔ دروازہ کھلتا تو میں زور سے آنکھیں میچ لیتی، مجھے لگتا تھا کہ ابھی میرے بال کھینچے جائیں گے یا ابھی مجھے زور سے پیٹھ پر مکا پڑے گا یا پائپ... اُف... وہ تکلیف اب بھی مجھے اپنے وجود پر محسوس ہوتی ہے۔

”فجر۔“ امینہ بھابی نے پکارا تو میں کانپ گئی۔

”پاگل... ڈر گئی...“ وہ مسکرائی تھیں۔ ”یہ لو کھانا کھالو۔“

”وہ... وہ کہاں ہیں؟“ میں نے لرزتے ہوئے پوچھا۔

”اپنے آفس میں بیٹھی ہیں... تم ڈرو مت... کھانا کھالو۔“

”نن... نہیں... مجھے بھوک نہیں ہے۔“ مجھے ڈر تھا کہ عذرا جہاں نے مجھے کھاتے دیکھ لیا تو مارے گی۔

”اوہوں... کھالو... صبح سے ناشتا کیا ہوا ہے۔ رات کے آٹھ بج رہے ہیں ابھی تک بھوک نہیں لگی۔ وہ زبردستی میرے ہاتھ میں روٹی کی چنگیر تھا کر چلی گئیں۔ سوکھی روٹی پر آلو میٹھی کا سالن... ایک ایک نوالہ حلق سے اتارتے ہوئے میں مجرموں کی طرح ادھر ادھر دیکھتی تھی۔ کھانا ختم کر کے میں نے چنگیر چار پائی کے نیچے رکھ دی۔ باہر جانے کا حوصلہ نہیں تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ کب تک یہیں بیٹھی رہوں گی۔ کب تک مار سے بچوں گی۔ میں نے بے اختیار اوپر دیکھا۔ چھت کی طرف... عجیب سے احساس نے گھیرے میں لیا تھا مجھے۔ یوں محسوس



ہوا جیسے کسی نے میرے کان میں سرگوشی کی ہو اور کہا ہو، ”کیا تجھے اب بھی اللہ یاد نہیں آتا۔“ میرے اندر کوئی بولا تھا اور چپ ہو گیا تھا۔ میں بلک اُٹھی، بے آواز روتی گئی، اللہ میری سنتا ہے کیا؟ اللہ میری سنے گا؟ کاش اللہ میری سنتا... کاش اللہ عام انسان کی بھی سن سکتا، بنا کسی واسطے کے، بنا کسی سہارے کے۔ بلاوجہ آنکھیں آسمان کی طرف اُٹھتیں اور پھر بنا کسی کو پکارے پلکیں گر جاتیں۔ ایمان اور یقین کا ننھا سادیا اندر کہیں دور غمٹا رہا تھا لیکن بدگمانیوں کا جنگل اتنا گھنا تھا کہ وہ مدھم سی روشنی وہم اور بدگمانی کی خاردار جھاڑیوں میں کہیں کھوجاتی تھی لیکن جب چاروں طرف راستے بند ہوں، عقل ساتھ چھوڑ دے تو ایمان کے ننھے سے دیے کی تلاش میں بدگمانیوں کا گھنا جنگل پار کرنے کا حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک ایک جھاڑی سے دامن چھڑا کر آگے بڑھنا کتنا دشوار ہوتا ہے، نوکدار کانٹے چبھتے ہیں، وجود لہو لہان ہوتا ہے، روح زخمی ہوتی ہے، جھوٹی تمناؤں کا لباس تارتار ہوتا ہے لیکن یہ سب سہنے کے بعد دھیرے دھیرے دیے کی لو اپنا آپ دکھانے لگتی ہے، پھر ایک لگن سی لگ جاتی ہے، تھکے ٹوٹے قدموں میں جان آنے لگتی ہے، ہمت از سر نو مجتمع ہوتی ہے، سناٹے پکارنے لگتے ہیں:

خاموشی کہہ رہی ہے کان میں کیا

آ رہا ہے میرے گمان میں کیا

یوں جو تکتا ہے آسمان کو ٹو

کوئی رہتا ہے آسمان میں کیا

آنسو تھے کہ تھمتے ہی نہیں تھے۔ دل بھر بھرا آتا تھا۔ میں بدگمانیوں کا جنگل پار کر رہی تھی۔ ایمان کا غمٹا تادیا روشن ستارے کی طرح عیاں ہونے لگا تھا، پھر.... پھر میرا وجود جیسے ان دیکھی روشنی سے بھرنے لگا.... میرے اندر حشر برپا تھا، میرا رواں رواں ایک ہی نام پکار رہا تھا، لب خاموش تھے لیکن کب تک خاموش رہتے، میں پکارا اُٹھی تھی، جھکی نظروں کے ساتھ، شرمندہ سی، نادم سی، بے قراری سی بے قراری تھی، یوں جیسے کسی اپنے سے بعد مدت ملاقات ہو رہی ہو، یہ پکار میرے لبوں کی نہیں میرے دل کی تھی، میری روح کی تھی:

”اللہ۔“

”مم... میرے اللہ۔“

”میرے اللہ“

میرے اندر کچھ ٹوٹا تھا، کچھ پکھلا تھا، میں پھر پکاری تھی۔

”میرے اللہ۔“

اور... اور پھر کوئی قوت مجھے غسل خانے کی طرف لے گئی آنسوؤں سے ترچہ کے ساتھ وضو کرتے ہوئے میرے اندر کیا ٹوٹ رہا تھا، کیا بکھر رہا تھا، میں سمجھنے سے قاصر تھی۔ بس اتنا یاد ہے میرے اندر کی تاریکی روشنی میں بدل رہی تھی، عشاء کی نماز ادا کرنے کے بعد سجدے میں گرے ہوئے مجھے لگتا تھا جیسے کوئی کھوئی ہوئی متاع مجھے مل گئی ہے۔ بارہ سال پہلے جو میں نے کھویا تھا، مجھے اپنے اندر ہی مل گیا تھا۔ میرا یقین، میرا ایمان، میرا اللہ۔ مجھے میرے رب سے بات کرنے کے لیے کسی واسطے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اب بھی میری سن رہا تھا۔ بارہ سال سے میں جس طرح ادھوری نمازیں ادا کرتی رہی تھی، احساس سے عاری وجود کے ساتھ زمین پر ٹکریں لگاتی رہی تھی، اس کے باوجود وہ مجھے سن رہا تھا۔ اتنے سال تک میں نے صرف شکوے کیے تھے، دعا نہیں کی تھی۔ اتنے سال تک میرا اور اللہ کا صرف ڈر کا رشتہ تھا، محبت اور یقین کا نہیں، بدگمانیوں نے مجھے میرے رب سے دور کر دیا تھا، میں نماز پڑھتی تھی لیکن دعا نہیں مانگتی تھی، ایک وقت وہ بھی تھا جب میں ہر لمحہ، ہر پل اپنے رب سے دعا مانگا کرتی تھی، ہر لمحہ اس کے ہونے کا احساس رہتا تھا، پھر اچانک یوں ہوا کہ مجھے لگا کہ وہ مجھ سے دور، بہت دور چلا گیا ہے۔ اتنی دور کہ میری آواز بھی اس تک نہیں پہنچ پاتی، بنا کسی واسطے، بنا کی سہارے کے وہ مجھے سن نہیں سکتا، پھر میں اس سے خوفزدہ ہو گئی، اتنی خوفزدہ کہ میں اس سے نظریں چرانے لگی، دعا مانگتے ڈرنے لگی کہ وہ میری نہیں سنے گا لیکن اب جب میں دعا کر رہی تھی تو مجھے لگتا تھا کہ وہ مجھے سن رہا ہے، وہ صرف مجھے سن رہا ہے۔ یہ احساس جہاں مجھے سرشار کر رہا تھا، وہیں ندامت میں مبتلا کر رہا تھا، اتنے سال میں نے بدگمانیوں کے رستے پر چلتے ہوئے گزار دیے تھے لیکن اب ایسا لگتا تھا جیسے سلسلہ وہیں سے جڑا ہے جہاں سے ٹوٹا تھا۔ میں اسی طرح اپنے رب سے بات کر رہی تھی جیسے سات سال کی عمر میں کیا کرتی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ تب میں آسمان کی طرف دیکھ کر بڑے مان اور محبت سے اللہ سے کہتی تھی، ”یا اللہ! یہ چھوٹا سا کام کر دے، پلیز، پلیز،“ اب ندامت سے سر جھکائے معافی کی طلبگار تھی۔ باہر نجانے کیا ہو رہا تھا لیکن امینہ بھابی کے کمرے سے

ملحق اسٹور کے ایک گوشے میں میری روح میں پلتے ناسور کی جراحی ہو رہی تھی، میرے بیمار جذبے رو بہ صحت تھے، اللہ کے سامنے خالی ہاتھ پھیلائے میں اس کی محبت اور مغفرت مانگ رہی تھی:

چلے ہم نقد عصیاں لے کے آمرزش کے سودے کو  
کہ نرخ اس جنس کا کچھ بھی نہیں رکھا گراں تو نے

میں وہیں جائے نماز پر لیٹے ہوئے اتنی گہری نیند سوئی تھی کہ گرد و پیش کا ہوش نہیں تھا، عذر جہاں کی مار کا ڈر نہیں تھا، کیا ہونے والا تھا اس کی پروا نہیں تھی۔ مجھے ایسی پرسکون نیند آئی تھی جیسے کوئی بچہ ماں کی آغوش میں سوتا ہے۔ ہر ڈر سے بے نیاز ہو کر اس یقین کے ساتھ کہ اس کی ماں اس کی طرف آنے والی ہر بلا سے اسے بچا لے گی۔ یہی اندھا یقین بندے کا اپنے اللہ پر ہوتا ہے اور جب یہ یقین دل میں گھر کر جائے تو بندہ ہر خوف سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ میں بھی اس کی پناہ میں تھی جو اپنے بندے سے ستر ماؤں سے بڑھ کر محبت کرتا ہے پھر بھلا سکون سے کیوں نہ سوتی۔ اس رات میں نے اللہ سے کچھ نہیں مانگا تھا، صرف اس کا ساتھ، اس کا سہارا مانگا تھا اور اس یقین کے ساتھ مانگا تھا کہ وہ مجھے ضرور دے گا۔

”فجر!..... فجر! یہاں سو رہی ہو؟“ امینہ بھابی کی آواز سے میری کھلی۔

”جی... بس پتا ہی نہیں چلا، نیند آ گئی۔“

”میری بات غور سے سنو!“ وہ رازداری سے بولیں۔

”یہاں رہنا تمہارے لیے ٹھیک نہیں... میں نے باتیں سنی ہیں اماں کی... وہ کسی سے فون پر تمہیں اٹھوانے کی پلاننگ کر رہی ہیں۔ صبح اتوار ہے، سب دیر سے اٹھیں گے تم ان کے اٹھنے سے پہلے یہاں سے چلی جانا۔“

”لیکن کہاں؟“ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

”کب سے میں بھی تو یہی سوچ رہی تھی کہ تم کہاں جاؤ گی۔ آخر ایک ٹھکانہ میرے ذہن میں آ ہی گیا۔ یہ ایڈریس پکڑو۔ آپا حمیدہ کے گھر کا ہے۔ میری امی کی سہیلی ہیں۔ بہت نیک عورت ہیں، تم ان کے پاس چلی جاؤ، اپنا مسئلہ بتاؤ۔ وہ تمہیں پناہ دیں گی، میرا یہ خط بھی انہیں دے دینا، اس میں میں نے تمہارے بارے میں کچھ باتیں لکھ دی ہیں تاکہ وہ تمہیں فراڈ نہ سمجھیں۔“

باقی کی رات ہم دونوں نے آنکھوں میں کاٹ دی تھی۔ وہ مجھ سے پوچھ رہی تھیں کہ فضیل کے بارے میں میرے جذبات کیا ہیں۔ میں کچھ بھی کہنے سے قاصر تھی۔ ”پتا نہیں۔“ میں بس اتنا ہی کہہ پائی تھی۔ وہ حیران میرا چہرہ دیکھ رہی تھیں لیکن جو میرے دل پر گزر رہی تھی وہ بتانا ممکن نہیں تھا۔ فضیل سے وابستہ اُمیدیں اس طرح چمکنا چور ہوئی تھیں کہ ان کرچیوں سے دوبارہ اپنا دامن بھرنے کی ہمت مجھ میں نہیں تھی۔ عذرا جہاں کے مجھ پر ہوتے ظلم دیکھ کر بھی وہ بے بسی سے نظریں جھکا لیتا تھا اور جس طرح وہ مجھے اس کے رحم و کرم پر چھوڑ کر چلا گیا تھا، آئندہ کے لیے مجھے نصیحت ہو چکی تھی کہ میں اس سے کوئی بھی اُمید نہ رکھوں:

وابستہ ہو گئی تھیں کچھ اُمیدیں آپ سے  
اُمید کے چراغ بجھانے کا شکریہ

اذان کی آواز آئی تو میں نے دل سے نماز پڑھی، اللہ سے مدد طلب کی۔ ہلکی روشنی میں امینہ بھا بھی نے میرے ہاتھ میں کچھ روپے تھمائے، حمیدہ آپا کا ایڈریس دیا اور چلے جانے کو کہا۔  
”ویسے تو یہاں سے صرف پون گھنٹے کا راستہ ہے لیکن تم سیدھا رکشامت کروانا بلکہ یہاں سے سمن آباد چلی جانا، وہاں سے دوبارہ رکشا کروا کر آگے جانا۔ اس علاقے کے رکشے والوں سے پوچھ گچھ کی جاسکتی ہے تمہارے بارے میں۔“

میں ممنون لگا ہوں سے انھیں دیکھتے ہوئے اس جگہ سے نکل آئی۔ زبان پر آیت الکرسی کا ورد کرتے ہوئے مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میں اکیلی نہیں ہوں۔ جیسے جیسے اس گھر کو میرے قدم پیچھے چھوڑ رہے تھے۔ میرے اندر عجیب سی سرشاری اُٹھ رہی تھی۔ مجھے آنے والے وقت کا خوف نہیں تھا کیونکہ میرا یقین میرے ساتھ تھا۔ میرا اللہ میرے ساتھ تھا۔ خواب کی سی کیفیت میں چلتے ہوئے صبح کے دس بجے میں اس گھر کے دروازے پر دستک دے رہی تھی جہاں اب بیٹھی ہوں۔ خالہ، سراپا نیکی۔ مجھے کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ میری آنکھ سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ مجھے حوصلہ دے رہی تھیں۔ انھوں نے مجھے ناشتا بنا کر دیا۔ سردرد کی دوا دی اور سونے کے لیے کہا۔ ظہر کی نماز کے بعد میں نے من و عن انھیں ساری بات بتادی۔ وہ میری بات سن کر مسکرائی تھیں اور کہا تھا۔ شکرانے کے نوافل ادا کرو، اللہ نے تمہیں درست مقام پر پہنچایا ہے۔ انھوں نے میرا ہاتھ چوما تھا۔ وہ

لس مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے امی نے مجھے پیار کیا ہو۔ مجھے امی بہت یاد آئی تھیں۔ آہ... امی!..... کس دکھ کے ساتھ اس دنیا سے چلی گئیں..... مجھے پچھتاؤں کی تپتی زمین پر ننگے پاؤں چلنے کے لیے چھوڑ گئیں۔

☆.....☆.....☆

کرم دین کسی کام سے گنج بخش جھویری کے دربار کے پاس آیا تھا۔ یونہی قدم اندر بڑھ گئے۔ فاتحہ پڑھنے کے بعد وہ باہر نکل آیا۔ اسے پھر سے زہرابی بی کا خیال آ گیا لیکن پھر سر جھٹک کر وہ باہر نکل آیا۔ گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا کہ یوں محسوس ہوا جیسے کوئی پیچھے آرہا تھا۔ بے اختیار پیچھے مڑ کر دیکھا تو پھٹے کپڑوں میں کوئی بھکارن تھی۔ اس کا چہرہ خاصا بھیا نک تھا۔ کرم دین نے رحم کھا کر اسے پیسے دے دیے لیکن وہ گاڑی کا شیشہ پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی آواز صاف نہیں تھی۔ کچھ غوں غاں کر رہی تھی۔ کرم دین نے غور کیا تو اس کے چہرے کا بغیر جلا حصہ کچھ شناسا معلوم ہوا۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی اور کرم دین وہ سمجھتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس کر رہا تھا۔ آخر ہمت کر کے پوچھ بیٹھا:

”زہرابی بی؟“ اس نے زور زور سے اثبات میں سر ہلایا۔ کرم دین کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ چہرہ کیا سے کیا ہو گیا تھا۔

”آپ بیٹھے۔“ اس نے دروازہ کھولا۔ بے یقینی سی بے یقینی تھی۔ وہ کچھ پوچھنے سے قاصر تھا لیکن پوچھے بنا چارہ نہ تھا۔

”یہ سب کیا ہوا؟“ آخر وہ رہ نہ سکا لیکن جواب میں وہ جو کچھ کہہ رہی تھی کرم دین سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ وہ اسے اپنے کوارٹر میں لے آیا۔

”آپ یہیں رکیں۔ میں شام سات بجے تک آؤں گا۔ کچھ کام نپٹانے ہیں اور یہ گاڑی مالک کو واپس کرنی ہے۔ اندر چاچا کریم بخش ہیں اور کوئی نہیں اور یہ کھانا کھا لیجیے گا۔“ اس نے کھانے کا لفافہ زہرا کے ہاتھ میں پکڑا یا جو راستے میں خریدا تھا، وہ اندر بڑھ گئی تو کرم دین نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

شام سات بجے وہ واپس آیا تو وہ سوئی ہوئی تھی۔ کرم دین نے سارا وقت عجیب سوچوں میں گزارا تھا۔ بہت سے سوال اس کے ذہن کو پریشان کر رہے تھے۔ اس نے زہرا کو سوتا چھوڑ کر کریم بخش کو دیکھا۔ اسے

کھانا دیا۔ کمرے سے باہر آیا تو وہ جاگ گئی۔ کرم دین وہیں بیٹھ گیا۔ ایک کمرے کے اس کوارٹر میں صحن کے ایک حصے میں غسل خانہ اور دوسرے حصے میں باورچی خانہ تھا۔ کوٹھی کے عقبی حصے میں تین سروٹ کوارٹرز تھے۔ جن میں سے ایک ڈرائیور کے لیے تھا۔ یہی کرم دین کے سرچھپانے کا ٹھکانہ تھا۔ دو چار پائیوں اور چٹائی کے علاوہ یہاں کوئی فرنیچر نہیں تھا۔ باورچی خانے میں سامان بھی بے حد محدود تھا لیکن کرم دین کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کافی تھا۔

”یہ سب کیسے ہوا زہرا بی بی؟“ زہرا نے ہاتھ کے اشارے سے لکھنے کے لیے کاغذ اور قلم مانگا۔ کرم دین تیزی سے اٹھا اور کاغذ قلم لے آیا۔ وہ کچھ لکھ رہی تھی لیکن کرم دین کو محسوس ہوا اس کے ہاتھ کپکپا رہے ہیں۔ پھر جیسے وہ لکھتے لکھتے تھک گئی۔ کاٹنے لگی۔ کھانسی کا دورہ سا پڑ گیا۔ کرم دین اس کے لیے پانی لایا۔ اس نے پانی پیا جو کچھ اس کے کپڑوں پر گر گیا۔ یقیناً اسے بولنے کے ساتھ ساتھ کھانے پینے میں بھی دشواری ہوتی ہوگی۔ اس کا چہرہ عجیب بے ہیئت سا ہو گیا تھا۔ کرم دین ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ وہ پھر سے کچھ لکھ رہی تھی۔ اس کے بار بار رکنے کے انداز سے کرم دین کو محسوس ہوا جیسے وہ بیمار ہے:

”آپ کی طبیعت ٹھیک ہے بی بی؟“ اس نے سر اٹھایا۔ آنسو اس کی آنکھوں میں آئے۔ وہ رونے لگی تھی، پھر کچھ لکھنے لگی اور کاغذ کرم دین کی طرف بڑھا دیا۔

”نہیں میں ٹھیک نہیں ہوں..... مجھے بہت درد ہے۔“ کرم دین نے باقی تحریر پڑھنے سے پہلے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے کھنچے ہوئے چلے چہرے کی طرف اشارہ کر رہی تھی یقیناً اسے وہیں درد ہو رہا ہوگا۔

”پتا نہیں کون تھے وہ..... انھوں نے میرے چہرے پر تیزاب پھینکا اور چلے گئے۔ جیپ سے مجھے ٹھوکر بھی ماری تھی، وہ سمجھے ہوں گے کہ میں مر گئی ہوں، اس لیے بھاگ گئے۔ لوگوں نے مجھے ہسپتال پہنچایا۔ میرے پاس پیسے تھے جو میرے دوست احسن زمان نے دیے تھے۔ پتا نہیں وہ کہاں گئے، خیراتی ہسپتال میں پڑی رہی میں۔ تھوڑا علاج کر کے ہسپتال والوں نے مجھے جانے دیا۔ میں سڑکوں پر گھوم رہی تھی جب اماں خیراتی اور بابا شہرانی مجھے مل گئے، وہ دونوں بھکاری تھے، میں انھیں کے ساتھ رہنے لگی۔ میرا چہرہ خراب ہو گیا ہے۔ سب ڈرتے ہیں مجھ سے۔ مجھے بھیک دیتے ہیں۔.....“

بس اتنا ہی لکھا تھا۔ کرم دین کو اس پر بہت رحم آیا۔ یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ اس طرح کا وار کس نے کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ شیردل کے آدمی کتوں کی طرح زہرا بی بی کو تلاش کر رہے تھے۔ اس نے کئی بار شیردل کی دھمکیاں سنی تھیں کہ وہ زہرا کو دردناک موت مارے گا۔ وہ ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ اس نے کاغذ پھر سے مانگا۔ کرم دین نے اسے دے دیا۔ وہ کچھ لکھ رہی تھی۔ پھر کرم دین کی طرف کاغذ بڑھا دیا:

”مجھے لگتا ہے بابا جان یا بھائی شیردل نے یہ سب کروایا ہے۔ تم ان کو میرے بارے میں نہ بتانا، ورنہ وہ مجھے جان سے مار دیں گے۔“

”نہیں..... زہرا بی بی میں ان کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ آپ سو جائیں میں کل آپ کو علاج کے لیے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گا۔“ وہ مطمئن ہو کر وہیں چٹائی پر لیٹ گئی۔

”آپ اندر چارپائی پر سو جائیں بی بی..... یہاں صحن میں مت لیٹیں۔“

”کرم دین مجھے اب فٹ پاتھوں پر سونے کی عادت ہے۔“ اس نے لکھا تھا اور کرم دین کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ کرم دین کے کہنے پر اندر چارپائی پر لیٹ گئی تھی۔

کرم دین چھت کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ وقت کتنا بے رحم ہے۔ چند ماہ پہلے والی زہرا اور آج کی زہرا میں کتنا فرق ہے۔ کیا اس نے سوچا ہوگا کہ اس کا اٹھایا قدم اسے کہاں پہنچا دے گا۔ اگر وہ جانتی ہوتی تو شاید ایسا کبھی نہ کرتی۔ اب کرم دین کی زندگی کا ایک اور امتحان شروع ہو گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرے؟ زہرا کو گھر واپس بھجوانے کا مطلب اپنے ہاتھوں سے اسے موت کے سپرد کرنا تھا۔ وہ اتنا بے رحم نہیں تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ رات کو گھر واپس آنے کے بعد وہ پڑھائی کیا کرتا تھا لیکن آج کتابیں کھولنے کو بھی اس کا جی نہیں چاہا۔ سوچوں کے گرداب میں جکڑے ہوئے کب نیند کی مہربان آغوش نے اسے آلیا اسے پتا بھی نہیں چلا تھا۔

☆.....☆.....☆

”تم؟“ دروازہ کھولتے ہی فضیل کو سامنے دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔

”اندر آنے کو نہیں کہو گی؟“



”نہیں..... تم چلے جاؤ یہاں سے۔ میری شادی ہوگئی ہے، اب تمہیں مجھ سے بات نہیں کرنی چاہیے۔“ یہ کہہ کر فجر نے دروازہ بند کرنا چاہا لیکن فضیل نے دروازے میں ہاتھ رکھ کر اسے ایسا کرنے سے باز رکھا۔

”دیکھو! مجھے تم سے بات کرنی ہے..... یوں دروازے پر کھڑے بات کروں گا تو تمہاری پوزیشن مشکوک ہوگی۔ بہتر ہے مجھے اندر آنے دو۔“

”مجھے نہ تم سے کوئی بات کرنی ہے اور نہ ہی تمہاری کوئی بات سننی ہے۔ اگر تم نے ہاتھ نہ ہٹایا تو میں شور مچاؤں گی۔“ وہ اپنے اندر کی تمام ہمت جمع کر کے بولی تھی۔

”اچھا صرف ایک بات کا جواب دو..... تم خوش ہو؟“ وہ اب بھی خوش اُمید تھا کہ شاید کوئی ایسا جواب ملے جو اس کے تن مردہ میں جان ڈال دے۔

”ہاں بہت۔“ اس نے سرد نگاہ فضیل پر ڈال کر کہا تھا۔ وہ لمحہ بھر کو ساکت رہ گیا۔ خوش فہمی کا کانچ اس کے لبوں سے نکلے دو لفظوں سے ٹوٹ کر بکھر گیا۔

”مفاہمت کی کوئی راہ نہیں۔“ فضیل کو اپنی آواز بہت گہرائی سے آتی معلوم ہوئی۔

”بالکل نہیں۔“ لہجہ قطعی تھا اور نگاہوں میں سرد مہری تھی۔ فضیل کے پاس الفاظ ختم ہو گئے۔ اس ریزہ ریزہ

کانچ کی ساری کرچیاں اس کے وجود میں اتر رہی تھیں۔ اس نے دروازے سے ہاتھ نکال لیا۔ دروازہ اس کے منہ پر زور سے بند کر دیا گیا۔ وہ شکستہ پاس گلی سے نکل رہا تھا۔ گلی کے موڑ پر اس نے پلٹ کر آخری نگاہ اس گھر پر ڈالی تو کوئی اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس ”کوئی“ کی خوش قسمتی پر رشک کرتے ہوئے وہ شکستہ مسکراہٹ کے ساتھ وہاں سے چلا گیا۔

”کاش! تم تھوڑا انتظار کر لیتیں۔“

”کاش! میں نے نکاح کے دو بولوں میں جکڑ دیا ہوتا تمہیں۔“

”کاش! آج تم مجھ سے کہہ دیتیں کہ تمہیں میرا انتظار تھا۔“

”کاش! میں تمہیں گھر لے جانے کی بجائے کہیں دور لے جاتا۔“

”کاش! میں یہیں مزدوری کر لیتا لیکن تمہیں یوں چھوڑ کر نہ جاتا۔“

ہر قدم پر کوئی حسرت اس کو جکڑ رہی تھی لیکن وہ جلد از جلد اس گلی سے دور نکل جانا چاہتا تھا کہ کہیں اس کے قدم اسے دھوکا نہ دے دیں۔ وہ پلٹ نہ جائے، اسے پلٹنا نہیں چاہیے تھا۔ اس لیے کہ پلٹتے قدموں پر اس کے لیے کوئی منزل نہیں تھی اور اگر کوئی منزل تھی تو وہاں تک جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا اور اگر کوئی راستہ تھا تو اس پر اتنے کانٹے تھے کہ وہ چل چل کر لہو لہان بھی ہو جاتا تو کبھی منزل تک نہ پہنچ پاتا بلکہ راستے میں ہی بھٹک جاتا لیکن اب وہ بھٹکنا نہیں چاہتا تھا اور نہ ہی اسے راہِ مستقیم سے بھٹکانا چاہتا تھا۔

☆.....☆.....☆

فجر دروازہ بند کر کے پلٹی ہی تھی کہ دروازے پر پھر سے دستک ہوئی۔ وہ بند دروازے سے ہی پکارا اٹھی تھی: ”فضیل چلے جاؤ یہاں سے..... اب یہ دروازہ کبھی نہیں کھل سکتا۔“

”فجر دروازہ کھولو“ معاذ کی آواز سن کر وہ بوکھلا گئی تھی۔ اس نے جلدی سے دروازہ کھولا۔

”کون تھا؟“ معاذ نے بے حد سرسری انداز میں پوچھا۔

”پت... پتا نہیں... شاید کوئی بھکاری تھا۔“ اتنا کہہ کر نظر چرا گئی تھی، معاذ چونک گیا۔ فجر کی غلط بیانی پر اسے تاؤ آنے لگا۔

”بھکاری کا نام فضیل تھا۔“ معاذ کے لہجے میں طنز تھا۔ اس کا رنگ فق ہو گیا تھا، وہ بنا کچھ کہے آگے بڑھ گئی۔

”اتفاق سے جلدی آگیا ہوں۔ خالہ کی کال آئی تھی انھیں لینے جانا تھا..... میں نے سوچا تھا گھر سے چکر لگا جاؤں.... شاید غلط سوچا تھا۔“ معاذ نے بلند آواز میں کہا تا کہ اس کے کانوں تک بات پہنچ جائے۔ اسے خود سمجھ نہیں آیا کہ وہ کیسے خود پر قابو کھو بیٹھا تھا۔

”آپ ایسے کیوں بات کر رہے ہیں؟“ وہ نظریں چراتی ہوئی بولی۔

”دماغ خراب ہے میرا؟ جاہل نہیں ہوں ورنہ تھپڑ مار کر پوچھتا کہ کس سے بات کر رہی تھی تم دروازے پر؟ اور نام تک جانتی ہو اس کا، پھر جھوٹ کیوں بولا مجھ سے..... کیوں باتیں چھپاتی ہو؟“ معاذ کا لہجہ سخت تھا اور آواز اونچی تھی۔ وہ اس آواز میں کبھی بھی بات نہیں کرتا تھا لیکن آج معاملہ کچھ الگ تھا۔

”دیکھو میں شکی مزاج نہیں ہوں لیکن سچی بات یہ ہے کہ تمہارا رویہ مجھے شک کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ ضروری

نہیں ہے کہ یہ منظر دیکھ کر جو میں سمجھا ہوں وہی حقیقت ہو لیکن تمہارے جھوٹ نے مجھے غلط سوچوں میں مبتلا کر دیا ہے۔ بہتر یہی ہوگا کہ تم خود مجھے سچ بتا دو۔ مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ جیسے تم زبردستی اس رشتے کو نبھار رہی ہو، مجھے نظر انداز کرتی ہو، میں نہیں چاہتا کہ تم یا میں مجبور یوں کے کسی بندھن میں بندھے رہیں۔ میں خالہ کو لینے جا رہا ہوں۔ جب واپس آؤں تو براہ کرم مجھے میرے سوالوں کا جواب دے دینا، میں مزید اس اضطراب کے ساتھ نہیں جی سکتا اور سچ مجھے کسی اور سے نہیں تمہاری زبانی سننا ہے۔“

وہ چلا گیا تھا لیکن فجر اسی طرح مجرم بنی سر جھکائے کتنی دیر کھڑی رہی۔ آخر وہ وقت آ گیا تھا جس کا خوف اسے ہر لمحہ بے قرار رکھتا تھا۔ ابھی ابھی تو وہ فضیل سے دامن چھڑا کر اللہ کے سامنے سر خرو ہوئی تھی اور ابھی ابھی ایک اور آزمائش اس کی منتظر تھی۔ خالہ کے آنے کی خبر کسی اور موقع پر ملتی تو شاید وہ خوشی سے جھوم رہی ہوتی لیکن اب، اس وقت خالہ کی آمد ہونے جا رہی تھی، جب وہ خود کسی پل صراط پر کھڑی تھی، یہ پل پار کرنا کس قدر دشوار تھا، یوں لگتا تھا جیسے یہ اس کی آخری آزمائش ہے، یا تو وہ اس پل سے گزر کر جنت پالے گی، یا پھر جہنم اس کا مقدر بننے والی تھی۔ شاید اب فیصلہ ہونے والا تھا کہ اللہ نے اس کی توبہ قبول کی ہے یا نہیں۔ ایسے کڑے وقت میں وہ خالہ کی آمد کی خوشی نہیں مناسکتی تھی۔ اسے معاذ کو حقیقت بتانی تھی لیکن ہمت پیدا نہیں ہوتی تھی۔ وہ ہمیشہ سے جانتی تھی کہ کبھی نہ کبھی ایسا ہوگا جب اسے یہ حقیقت بتانی پڑے گی لیکن اس طرح ہوگا، یہ علم نہیں تھا۔

اسے کامل یقین تھا کہ اللہ اسے بے آسرا نہیں چھوڑے گا لیکن ان وسوسوں کا کیا کرتی جن کی جھاڑیاں ابھی بھی کبھی کبھار اندر کہیں اُگ آتی تھیں جنہیں کانٹے کاٹتے کاٹتے وہ لہو لہان ہوئی جاتی تھی تاکہ یقین اور ایمان کی لومدھم نہ ہو لیکن نجانے یہ جنگل کتنا گھنا اور کتنا تاریک تھا جو ختم ہونے کو ہی نہیں آتا تھا۔ ایک لمحہ یوں محسوس ہوتا کہ ایمان کا دیا اس کے اندر پوری آب و تاب سے روشن ہے، دوسرے لمحے دوساس کا جنگل اندر پھر سے تاریکی کرنے لگتا۔ یہی لمحہ آزمائش کا ہوتا ہے جو اس آزمائش سے گزر جائے اس کے اندر کی تاریکی رب خود دور کرتا ہے اور جو اس لمحے کی قید میں آجائے، وہ خوار ہوتا رہتا ہے، بھٹک جاتا ہے لیکن اب وہ بھٹکنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ جان گئی تھی کہ یہ آزمائش اس کے رب کا امتحان ہے، وہ سو جان سے اس امتحان کے لیے تیار تھی۔ یقین مستحکم تھا کہ اللہ اس کی ہمت سے بڑھ کر اسے آزمائش میں مبتلا نہیں کرے گا۔ اس نے اپنا احتساب کرنا سیکھ لیا تھا، اپنی غلطیوں کو

مصلحت کی آڑ میں چھپانا وہ چھوڑ چکی تھی، اس لیے اب کوئی مشکل اس کے لیے مشکل نہیں رہی تھی، وہ یہ بھی جانتی تھی کہ خطا اس سے ہوئی ہے، اسے اپنے مجازی خدا سے جھوٹ نہیں بولنا چاہیے تھا لیکن وہ بول چکی تھی، اس لیے اب وہ سزا کے لیے تیار تھی۔ سر تسلیم خم تھا، جو بھی مزاج یار میں آئے۔ اندیشے، خوف، وسوسے بالائے طاق رکھتے ہوئے اس نے سچ کہنے کا ارادہ کر لیا تھا، لیکن کیسے؟ پھر کیا ایک اسے اپنی ڈائری کا خیال آیا۔ اس نے آخری ورق پر کچھ لکھا اور ڈائری بیڈ کی اُس سمت پر رکھ دی جہاں معاذ سوتا تھا۔ شاید قدرت نے اسی مقصد کے لیے یہ سب اس سے لکھوایا تھا کہ آج اس کی قسمت کا فیصلہ ہو جائے۔ آنسو پلکوں سے گرے اور ہتھیلی میں جذب ہو گئے۔ اندر گہرا سناٹا تھا، اسے یوں محسوس ہوا جیسے یہ سکوت طوفان کی آمد کا پیش خیمہ ہے۔

☆.....☆.....☆

رات بڑی مشکل سے کٹی۔ زہرا کو تیز بخار تھا اور وہ تمام رات درد سے چلاتی رہی تھی۔ کرم دین زہرا کو ہسپتال لے آیا تھا اور فوری طور پر اس کا علاج ہونے لگا۔ بلڈ ٹیسٹ کی رپورٹ آنے تک اسے ہسپتال میں ہی روکا گیا تھا۔ کرم دین نے مریم کو فون کر کے سب حالات سے آگاہ کیا۔ مریم اپنی امی کے ساتھ ہسپتال آ گئی۔ زہرا کی حالت دیکھ کر وہ بے اختیار رو دی تھی۔ ان دونوں کو وہیں ہسپتال چھوڑ کر کرم دین اپنی ڈیوٹی پر گیا۔ واپسی پر ایک اور تکلیف دہ خبر منتظر تھی۔ زہرا کو ڈیٹنگی بخار تھا جو کہ غلط ادویات کے استعمال کی وجہ سے بگڑ چکا تھا۔ اس کے خون سے سرخ خلیے تیزی سے کم ہو رہے تھے۔ اس کے پیٹ اور سر کا درد بڑھتا جا رہا تھا۔ رپورٹ کے مطابق اسے فوری طور پر سرخ خلیوں کی ضرورت تھی۔ ہسپتال کی ایک ایک اینٹ پیسا مانگتی ہے۔ ابھی کرم دین کو روپوں کے انتظام کے لیے دوڑ دھوپ کرنا تھی۔ مریم کی امی نے کرم دین کی غیر موجودگی میں دو ہزار روپے کی ادویات خریدی تھیں۔ کرم دین نے وہ پیسے انھیں واپس کرنے چاہے لیکن انھوں نے لینے سے انکار کر دیا تھا لیکن کرم دین نے بھدا صرار انھیں روپے واپس کر دیے تھے کیونکہ وہ ان کے گھر کے حالات سے بھی واقف تھا۔ اس نے اپنے مالک سے اگلے مہینے کی تنخواہ ایڈوانس میں لینے کی بات کی لیکن اس کی نوبت نہ آئی اور اسی رات زہرا تکلیف کی شدت سے تڑپتی ہوئی راہی ملک عدم ہوئی۔

کرم دین پر یہ خبر بجلی کی طرح گری تھی۔ زہرا کا بے دم وجود لمحہ بھر کے لیے اسے لرزا گیا تھا۔ ہنستی مسکراتی،

شوخی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو گئی تھیں۔ پارہ صفت وجود ساکت ہو گیا تھا۔ زہرا کی شرارتی ہنسی، اس کی چہکتی آواز، کبھی اس کا التجا کرنا، کبھی دھمکانا، کبھی دھونس جمانا کرم دین کو رہ کر یاد آ رہا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ زندگی یوں بھی ختم ہوتی ہے؟ یہ سب کیا ہوا تھا؟ ہسپتال کے بیڈ پر سر سے پاؤں تک سفید چادر میں ڈھانپے وجود کو دیکھ کر ایک کے بعد ایک سوال اسے پریشان کر رہا تھا۔ رات کے آخری پہرہ وہ روتی تڑپتی ہمیشہ کے لیے دنیا سے رخصت ہو گئی۔

صرف چند ماہ پہلے تک وہ زندگی سے بھرپور لڑتی تھی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا کہ اسے اس طرح درد ناک موت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ شاید اس کی موت تو اسی روز واقع ہو گئی ہوگی جس روز اس کا چہرہ خراب ہوا تھا۔ پتا نہیں اس نے یہ صدمہ کیسے جھیلا ہوگا؟ وہ بلا کی حسن پرست تھی اور اپنے چہرے کے معاملے میں بے حد حساس بھی۔ کرم دین کو یاد تھا جب اس کے چہرے پر گرمی دانہ لگلا تھا جو ٹھیک ہوتے ہوئے نشان چھوڑ گیا تھا، وہ اس نشان کی وجہ سے کتنی پریشان تھی۔ اس کی سہیلی نے اسے ایک کریم بتائی جس کے استعمال سے وہ نشان مٹ سکتا تھا لیکن وہ کریم کسی عام دکان سے نہیں ملتی تھی۔ اس نے کرم دین کی جان عذاب کر رکھی جب تک وہ کریم اسے مل نہ گئی اور جب تک اس کے چہرے سے وہ نشان ختم نہیں ہو گیا۔ کہاں وہ ایک نشان اور کہاں یہ چہرہ۔ اس کا ساکت اور بھیاں ک چہرہ دیکھ کر کرم دین نے سر دآہ بھری اور آنکھوں میں آنی نمی کو انگلیوں کی پوروں میں سمیٹ لیا۔

اسے زہرا سے بہت شکایات تھیں۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک بار زہرا اسے مل جائے تاکہ وہ اس سے جواب طلبی کر سکے، اسے شرمندہ کر سکے لیکن جس حال میں وہ اسے ملی تھی اس کی تمام شکایات نے اندر ہی اندر دم توڑ دیا تھا اور اب بے اختیار اس کے لبوں سے یہ دعا نکلتی تھی:

”جائیے زہرا بی بی میں نے آپ کو دل سے معاف کیا۔ اللہ بھی آپ کو معاف کرے اور ابدی زندگی کا سفر آپ پر آسان ہو۔“

رات کے تین بجے وہ زہرا کے مردہ جسم کو اپنے کوارٹر میں لے آیا تھا۔ اسے یاد تھا کہ ایک بار پہلے بھی وہ رات کے تین بجے اسے حویلی لے کر گیا تھا جب وہ ہوش و حواس سے بیگانہ تھی آج بھی وہ ہوش و حواس سے بیگانہ

تھی لیکن فرق اتنا تھا کہ اس وقت وہ دن چڑھے ہوٹا میں آگئی تھی لیکن اب اسے کبھی ہوٹا نہیں آتا تھا۔ اس نے چار پائی پر زہرا کا بے جان وجود ڈال دیا اور خود اس کے سر ہانے بیٹھ گیا۔ آنکھیں غم تھیں، سوچوں کا نہ تھمنے والا سلسلہ اسے اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔

انسانی وجود کتنا ناپائیدار ہوتا ہے۔ صرف سانس چلنے تک زندگی باقی ہے۔ سانس ساکت، زندگی ختم۔ تکلیف ختم، خوشی ختم، رشتے ختم، تعلق ختم، کام دھندے ختم، ذمہ داریاں ختم، فکر ختم، اندیشے ختم، سب فنا، سب ختم۔ آہ فانی انسان!

دنیا میں ہوتا ہے تو سمجھ بیٹھتا ہے یہی دنیا سب کچھ ہے۔ یوں جیسے ہمیشہ کے لیے یہیں رہے گا۔ نہ یہ سوچتا ہے کہ جب وہ نہیں تھا تب بھی دنیا اسی طرح چل رہی تھی۔ نہ یہ خیال کرتا ہے کہ جب یہاں سے چلا جائے گا تب بھی دنیا کو کوئی فرق نہیں پڑے گا یونہی سب چلا رہے گا۔ کسی ایک کی کوئی کمی نہیں ہوتی لیکن اسے لگتا ہے ساری دنیا اسی کے دم سے ہے۔ آہ خوش فہم انسان!

اپنے آپ کو سجانے بنانے کی فکر میں یوں لگا رہتا ہے جیسے ہمیشہ یونہی حسین رہے گا۔ نہیں سمجھتا کہ یہ حسین وجود ایک دن مٹی میں مل کر مٹی ہو جانا ہوتا ہے۔ کچھ نہیں بچتا، نہ چہرہ، نہ ہونٹ، نہ آنکھیں، نہ ہاتھ۔ پھر بھی بچتا رہتا ہے، قیمتی لباس، قیمتی جوتے، سر سے پاؤں تک قیمتی اشیاء سے مزین، سمجھتا ہے کہ اس کی یہ سبج دج مرنے کے بعد بھی رہی گی۔

آہ نا سمجھ انسان!

رات ڈھل رہی تھی۔ دھیرے دھیرے تاریکی روشنی میں بدلتی جا رہی تھی۔ ابھی اس نئے دن کے اجالے دیکھنے والے تھے سوائے اس ایک ہستی کے، جو بے حس و حرکت کرم دین کے سامنے چار پائی پر لیٹی تھی۔ ملجی روشنی میں پرندوں کی چہکار، دن کی گہما گہمی کے آثار، کھلتے بند ہوتے دروازوں کی چرچاہٹ اور انسانی باتوں کی آوازیں سن کر کرم دین کی سوچوں کا سلسلہ ختم گیا۔ آنکھ سے آنسو پونچھ کر وہ باہر کی جانب بڑھا اور اپنے ساتھ والے کوارٹرز میں زہرا کی موت کی اطلاع کی۔ کوارٹرز میں اس نے زہرا بی بی کا تعارف کریم بخش کی بیٹی کی

حیثیت سے کروایا تھا۔ کچھ پڑوسی گھر میں آگئے تو وہ تدفین کے انتظامات کے لیے باہر چلا گیا تھا۔ اس نے مریم کو بھی اطلاع کر دی تھی۔ وہ بھی اپنی امی کے ساتھ آگئی تھی۔ پڑوسی عورتوں نے کرم دین کا ساتھ دیا تھا۔ میت کو نہلانے کے علاوہ گھر کے اندر کی بہت سی ذمہ داریاں انھوں نے کرم دین کے کہے بغیر ہی پوری کر دی تھیں۔ انسانیت نے ابھی پوری طرح دم نہیں توڑا۔ ابھی اس کا تنفس باقی ہے۔ بس احساس کی تازہ ہوا ملتی رہے تو اس کی سانسیں چلتی رہیں گی۔ جب وہ واپس آیا تو کریم بخش کو زہرا کی میت کے سرہانے روتے ہوئے پایا۔ اسے دیکھ کر وہ اس کی طرف بڑھا:

”کرم دینا! اوئے کرم دینا! میری بیٹی مجھے چھوڑ کر چلی گئی..... میری رانی چلی گئی کرم دین!“ وہ روتا چلا جا رہا تھا اور یہی بات دہرا رہا تھا۔ کرم دین کی غیر موجودگی میں کسی پڑوسی نے کریم بخش سے کہا تھا کہ اس کی بیٹی اس دنیا سے رخصت ہو گئی ہے اور اسے میت کے پاس لے آیا تھا۔ وہ میت دیکھ کر خود سے بیگانے کریم بخش کی حیات بیدار ہو گئی تھیں۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ کرم دین سے لپٹ کر اپنی بیٹی رانی کی موت کا ماتم کر رہا تھا۔ اس نے اپنی بیٹی کو بجلی کی نگلی تاروں سے لپٹے دیکھا تھا، اس کی نظروں کے سامنے وہ تڑپ تڑپ کر دم توڑ گئی لیکن خالموں نے اسے بیٹی کی میت کو چھونے دیا، نہ اس کے جنازے کو کاغذ ہادینے کی اجازت دی، اسے اس بات کی اجازت بھی نہیں تھی کہ وہ اپنی بیٹی کی قبر پر جا کر ماتم کر سکے کیونکہ اس کی قبر پیر صاحب کے آبائی قبرستان میں تھی جہاں صرف ان کے خاندان کے لوگ دفن تھے۔ مولوی اللہ دتا کا بیٹا اور اس کی بیوی بھی آئے تھے، حویلی سے شیدا بھی خبر سن کر آیا تھا۔ یہی وہ چند لوگ تھے جو کرم دین اور کریم بخش کے یہاں ٹھہرنے کے بارے میں باخبر تھے اور یہی لوگ آج تدفین میں بھی شامل تھے۔ کریم بخش کی بے چین روح کو قرار آ گیا تھا۔ اسے لگتا تھا جیسے وہ اپنی بیٹی کی تدفین کر رہا ہے۔ کرم دین یہ منظر دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ شاید یہی وہ مقصد تھا جس کی وجہ سے وہ لاشعوری طور پر زہرا کو تلاش کر رہا تھا۔ اس کے خاندان کا ایک قرض تھا اس بوڑھے کی جان پر، زہرا کی موت نے وہ قرض چکا دیا تھا۔ اس کی بیٹی کی تدفین ان لوگوں کی تھی اور ان کی بیٹی کی تدفین بوڑھے کریم بخش کے ہاتھوں ہو رہی تھی۔ انسان نا انصاف ہے، اللہ نا انصاف نہیں۔

☆.....☆.....☆



”یہ تمہاری ماں کی امانت ہے میرے پاس۔“ فجر ہکا بکا سی خالہ کے پاس وہ زیور دیکھ رہی تھی جو دادی نے اس کی امی کے پاس رکھوائے تھے۔ وہ حیرت سے گنگ تھی۔ ایک ایک زیور کو چھوتے ہوئے وہ کسی خواب کی کیفیت میں ماں اور دادی کا لمس محسوس کر رہی تھی۔ آنسو گال پر بہہ رہے تھے:

”یہ.... یہ آپ کے پاس کیسے آئے؟“

”تمہاری ماں نے خود مجھے دیے تھے۔“ وہ بے یقینی سے انھیں دیکھ رہی تھی۔

”میری امی نے.... لیل..... لیکن وہ کیسے؟“

”اس لیے کہ میری بہن تمہاری ماں کی دیورانی تھی۔ معاذ تمہارا چچا زاد ہے۔ بچپن میں تمہاری مگنی تمہاری دادی نے معاذ کے ساتھ کی تھی لیکن قسمت کے کھیل ہیں۔ تمہارے چچا چچی کے انتقال کے بعد شاید تمہارے والد اس رشتے کو برقرار نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ تمہاری امی نے پہلے مجھ سے فون پر بات کی اور مجھ سے پوچھا کہ میں اس رشتے کو برقرار رکھنا چاہتی ہوں یا نہیں۔ مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ میں نے ہامی بھر لی، ہاں اتنا ضرور کہا تھا کہ معاذ کی رائے میرے لیے مقدم ہے۔ پھر ایک روز تمہاری امی میرے پاس چلی آئیں انھوں نے بتایا کہ تمہارے ابو اس رشتے کے لیے رضا مند نہیں ہیں اور وہ تمہاری شادی جہاں کرنا چاہتے ہیں وہ رشتہ تمہارے لیے انتہائی غیر مناسب ہے۔ وہ بہت پریشان تھیں، انھوں نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں چوری چھپے تمہارا نکاح معاذ سے کروادوں۔ اسی لیے وہ یہ زیور اور کچھ نقد دے کر گئی تھیں کہ میں تمہارے لیے کچھ کپڑے بنالوں۔ میں نے وہ سب رکھ لیا۔ اس روز مجھے معاذ سے بات کرنے کا موقع نہیں مل سکا کیونکہ معاذ ان دنوں کافی مصروف تھا۔ دو روز بعد انھوں نے فون کر کے مجھے تمہاری موت کی اطلاع دی۔ وہ بہت دل گرفتہ تھیں، میں نے انھیں صبر کرنے کی تلقین کی تھی لیکن شاید وہ صبر کھو چکی تھیں۔ کچھ دن بعد میں تمہارے گھر یہ سب سامان واپس کرنے گئی تو پتا چلا تمہاری امی کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس روز میں افسوس کر کے واپس چلی آئی کیونکہ یہ سب لوٹانے کے لیے وہ وقت مناسب نہیں تھا۔ میں نے سوچا تھا کچھ عرصہ گزر جائے گا تب یہ سامان لوٹا دوں گی لیکن خدا کی کرنی ایسی ہوئی کہ تم اس مناسب وقت سے پہلے یہاں چلی آئی۔ تمہاری داستان سن کر، تمہارے امی ابو کے نام پتا کر کے میں سمجھ گئی تھی کہ یہ سب تمہاری امانت ہے جو اللہ نے اس وقت مجھے لوٹانے سے روک دیا تھا۔ اسی لیے میں نے

پہلی فرصت میں تمھاری امی کی آخری خواہش کی تکمیل کی۔ تمھاری دل گرفتگی دیکھتے ہوئے میں نے دانستاً تم سے یہ بات چھپائی تھی کہ غم کی شدت کم ہو جائے تب بتاؤں گی۔“ خالہ یہ سب بتا کر خاموش ہو گئیں۔ آنسو تو اتر سے اس کا چہرہ بھگور رہے تھے وہ ان زیورات کو چوم رہی تھی۔ اپنی ماں اور دادی کا لمس محسوس کرتے ہوئے عجیب سے احساس سے دوچار تھی۔ خالہ نے اسے رونے دیا تا کہ دل کا غبار نکل جائے۔ آنسو تھے کہ تقم ہی نہیں رہے تھے۔

”اللہ کی مرضی یہی تھی بیٹا! بس اب خاموش ہو جاؤ۔“

اسے زار و قطار رو تادیکھ کر بالآخر خالہ نے اسے حوصلہ دیا۔

”میں بہت بے صبری تھی خالہ... مجھ سے صبر نہ ہوا۔ کیوں صبر نہ ہوا؟“ وہ خود کو کوس رہی تھی۔ خالہ نے اسے گلے سے لگا لیا۔

”انسان بڑا بے صبر ہے بچے! بس اب خود کو اس طرح ہلکان نہ کرو۔ یہ سب اسی طرح ہونا تھا، سو ہو گیا۔ ہم تم نہ گزرا وقت واپس لا سکتے ہیں، نہ بچھتاوے پھڑے ہوؤں کو ملا سکتے تھے... بس صبر کرو کہ سوائے صبر کے اب کوئی چارہ نہیں۔ اللہ سے توبہ کرو۔ اپنی ماں کی مغفرت کی دعا کرو۔ یوں رو کر اس کی روح کو تکلیف مت دو۔“

”میں بہت بری ہوں خالہ! میں... میں نے بہت برا کیا۔ میری عقل پر پتھر پڑ گئے تھے۔ مجھے عالیہ نے بہت سمجھایا تھا لیکن میں باز نہ آئی۔“ وہ اتار کوئی کہ چکیاں بندھ گئیں۔ خالہ کا کوئی دلا سہ اس کے آنسو نہیں روک پا رہا تھا۔ ندامت کے آنسو، پشیمانی کے آنسو، افسوس کے آنسو، اپنوں کی محبت کے آنسو، اللہ کے کرم اور اس کے رحم کی انتہا پر شکر گزاری کے آنسو۔ وہ نہ جانے کس کس بات پر رو رہی تھی لیکن یہ بہتے ہوئے آنسو اللہ پر اس کا یقین پختہ کر رہے تھے۔ اس کے اندر ایمان کا دیار روشن تر ہو رہا تھا اور روح کے داغ دھلتے جا رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

”یہ سب کیا ہے؟“ معاذ نے ڈائری بیڈ پر اچھالتے ہوئے کہا۔ فجر کا دل بھی جیسے اچھل کر حلق میں آ گیا۔

”آپ کے سوالوں کا جواب۔“ وہ اتنا ہی کہہ پائی۔

”اسی لیے یہ سب لکھا تھا تم نے؟“ وہ سمجھ نہ پائی کہ اس کے لہجے میں کیا تھا۔

”نہیں... یہ سب لکھنے کا ایک مقصد یہ بھی ہوگا، میں نے سوچا تک نہیں تھا، یہ لکھنے کا مقصد کچھ اور تھا۔“ وہ بیٹا

اس کی طرف دیکھے بول رہی تھی۔ اس کی نظریں ڈائری کے ہوا سے الٹ پلٹ ہوتے صفحات پر تھیں۔

”کیا مقصد تھا یہ سب لکھنے کا؟“

”اپنا احتساب۔“

”مقصد پورا ہو گیا؟“

”ہاں شاید۔“ اس نے نظریں اٹھائیں اور جھکالیں۔ وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”ہوں.... تو فجر ارمغان...“ وہ بستر پر ڈھے گیا، ”تو آپ میرے تایا کی بیٹی ہیں۔ میں سمجھ نہیں پایا کہ یہ

محض اتفاق ہے یا سوچا سمجھا منصوبہ..... کھڑی کیوں ہو... بیٹھ جاؤ۔“

”نہیں میں یوں ہی ٹھیک ہوں۔“

”ارے نہیں... بیٹھ جاؤ... یوں لگتا ہے جیسے کوئی مجرم کھڑا ہے سزا سننے کا منتظر۔“

”آپ نے ٹھیک کہا... میں سزا سننے کی منتظر ہوں۔“

”پہلے مجھے میری باتوں کا جواب چاہیے۔“ وہ حیران ہوئی۔

”میں نے سب صاف صاف... اور سچ لکھا ہے۔ اب کس بات کا جواب چاہیے؟“

”ہاں میں نے پڑھا ہے جو تم نے لکھا ہے لیکن مجھے وہ جاننا ہے جو تم نے نہیں لکھا۔“

”کیا؟“

”یہ شادی تم نے مجبوراً کی ہے؟“ وہ سناٹے میں آگئی۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ تائی اماں خالہ جان سے ملنے آئی تھیں۔ یہ میں جانتا ہوں، کیوں ملنے آئی تھیں یہ مجھے تمہاری

ڈائری پڑھ کر علم ہو گیا یعنی وہ چاہتی تھیں کہ دادی کی آخری خواہش پوری ہو لیکن تم نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے فضیل

کے ساتھ.....“ اس نے بات دانستاً ادھوری چھوڑ دی اور فجر کی طرف دیکھا۔ وہ فق چہرے کے ساتھ اسے دیکھ

رہی تھی۔

”اس دن یہ فضیل نامی شخص دوبارہ تم سے ملنے آیا۔ کیوں آیا ہوگا میں سمجھ سکتا ہوں۔ تم کیا چاہتی ہو اب؟“

”آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ میں نے فضیل نامی شخص پر دروازہ نہیں کھولا تھا۔“

”وہ تمہاری مجبوری تھی اس لیے کہ تم میرے نکاح میں تھی۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب تم سمجھ سکتی ہو۔“

”آپ مجھ پر شک کر رہے ہیں؟“

”یہی سمجھ لو۔“ معاذ نے خشک لہجے میں کہا۔ فجر پتھر کا بت بنے کھڑی رہی، تو آزمائش ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

”میں نے ڈائری میں جو کچھ لکھا وہ سچ تھا، حرف بہ حرف سچ۔“

”وہ ایک الگ قصہ ہے..... کیا تم یہ رشتہ قائم رکھنا چاہتی ہو؟“ اس کا لہجہ خشک اور سرد تھا۔

”جی؟“ لہجہ استفہامیہ تھا۔

”جی، کیا مطلب؟ میری بات بہت سادہ ہے، کیا تم یہ رشتہ قائم رکھنا چاہتی ہو؟“ معاذ نے ایک ایک لفظ پر زور دیا۔

”یہی سوال اگر میں آپ سے کروں تو؟“ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھ رہی تھی۔

”میرا جواب بہت سادہ ہوگا کہ ہاں میری مجبوری ہے.... لیکن تمہاری کوئی مجبوری نہیں ہے تمہیں رشتے توڑنے اور چھوڑ کر جانے کی عادت ہے۔“ آنسو فجر کی آنکھ سے نکل کر گال سے بہتے ہوئے دوپٹے میں جذب ہو گئے لیکن دوسری طرف کسی کو پروا نہیں تھی۔ وہ سفاک لہجے میں سچ بول رہا تھا۔

ہاں جب یہ رشتہ ہوا تو میں بھی خوش تھا لیکن اتنا سب جاننے کے بعد..... معاف کرنا میں اتنا باظرف نہیں ہوں کہ ایک آن میں سب بھلا سکوں۔ میں کوشش کروں گا کہ اس رشتے کو اچھی طرح نبھاسکوں کیونکہ اس رشتے میں میری دادی کی ہی نہیں بلکہ میری امی کی خوشی بھی تھی۔ وہ جب بھی تمہارے لیے کچھ تحفہ لیتیں تو مجھے یاد دلانا ضروری سمجھتیں کہ یہ انہوں نے میری دلہن کے لیے لیا ہے۔ تمہاری ڈائری مجھے لمحہ بھر کو میرے اس ماضی کی طرف لے گئی تھی جسے میں لگ بھگ بھول چکا تھا لیکن سچ یہی ہے کہ میں سب بھول کر بھی تم کو بھلا نہیں پایا تھا۔

اس روز جب تائی امی خالہ جان سے ملنے آئی تھیں تو بے اختیار مجھے تم یاد آ گئی لیکن تمہارے بارے میں پوچھنے کی ہمت نہیں تھی۔ پھر خالہ نے ایک دن مجھے تمہاری ناگہانی موت کے بارے میں بتایا۔ میں بہت دن تک اپ سیٹ رہا تھا۔ تم سے کوئی دلی وابستگی نہیں تھی پھر بھی اس خبر نے مجھے بہت دن بے چین رکھا۔ پھر وہ دن بھی آیا جب میں اور خالہ وہاں تائی جان سے ملنے گئے کتنی پرانی یادیں تازہ ہو گئیں لیکن تائی جان کے انتقال کی خبر سن کر ایک دھچکا لگا۔ اس درود یوار سے میری کچھ اچھی یادیں وابستہ نہیں تھیں۔ تایا جان اور چچا جان کی مار میں کبھی بھول نہیں پایا لیکن وہیں مجھے امی ابو کا بہت سا پیار بھی ملا تھا۔ امی ابو کے انتقال کے بعد تائی جان اور چچی جان کا بدلا رویہ مجھے اب بھی تکلیف دیتا ہے لیکن تائی جان کی موت کی خبر نے دل بہت بوجھل کر دیا تھا۔“ معاذ کی آواز بھرا گئی۔ رونے کی وجہ سے فجر کی آنکھیں پہلے ہی سوچی ہوئی تھیں لیکن آنسو پھر سے ٹپ ٹپ بہنے لگے۔

”خالہ نے نکاح کے وقت مجھے نہیں بتایا کہ میرا نکاح کس سے ہو رہا ہے۔ میری یادوں کے سائے بہت دھندلے تھے۔ تمہارا نام اور ولدیت بھی مجھے کچھ یاد نہ دلا سکی۔ ہاں تمہاری آنکھیں کبھی مجھے چوکنے پر مجبور کر دیا کرتی تھیں۔ میں بہت بے چین رہا کرتا تھا کہ تم مجھے اپنے بارے میں سب بتاؤ تا کہ میرے دل کی الجھن دور ہو سکے۔ لیکن تم نے بہت دیر کر دی۔“ آخری الفاظ کہتے ہوئے اس نے ایک سرد نگاہ فجر پر ڈالی تھی۔

”ہاں شاید بہت دیر کر دی۔“

معاذ کا چہرہ ساٹ تھا۔ وہ چپ رہی دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں لیکن کچھ کہنے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ اس کی خاموش سسکیوں کو نظر انداز کر کے پھر سے گویا ہوا:

”سچ کہوں تو میں تمہیں یقین نہیں دلا سکتا کہ پہلے کی طرح دل و جان سے یہ رشتہ نبھاسکوں گا لیکن میں نے حالات سے سمجھوتا کر لیا ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ ایک شوہر کی حیثیت سے اپنے تمام فرائض پورے کر سکوں لیکن پتا نہیں پہلے جیسے حالات ہو پائیں گے یا نہیں۔ میں ایک عام انسان ہوں فجر! فرشتہ نہیں۔“ وہ اپنی کپٹیاں سہلا رہا تھا۔ ایک نظر اس پر ڈال کر پھر گویا ہوا۔

”ہو سکتا ہے کہ یہ سب وقتی اشتعال ہو... وقت گزرنے کے ساتھ شاید میں سب بھول جاؤں لیکن میں تمہیں کسی دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ اب تم پر ہے کہ سمجھوتے بھری زندگی گزار سکتی ہو کہ نہیں... مجھے لگتا ہے کہ وہ

فضیل نامی شخص پھر کبھی دروازے پر ضرور دستک دے گا۔ چاہو تو دروازہ کھول دینا میری طرف سے اجازت ہے۔“ معاذ کاٹ دار لہجے میں کہتا ہوا باہر چلا گیا۔ فجر ڈھے گئی تھی۔

”یا اللہ! مجھے معاف کر دے۔ میری آزمائشیں ختم کر دے..... مجھے ثابت قدم رکھ۔“ آنسوؤں سے تر ہونے والے لہجے کے ساتھ دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اس نے دعا کی۔

☆.....☆.....☆

ٹی وی پر معاذ نیوز چینل پر ایک پروگرام دیکھنے میں مصروف تھا۔ جس میں نیوز چینل کی چھاپہ مارٹیم ایک گودام میں ملاوٹ کیے جانے والی اشیاء دکھا رہی تھی۔

”یہ دیکھیے ناظرین! گودام کے اس حصے میں اناج میں ملاوٹ کی جارہی ہے۔ یہ وہ پتھر ہیں جنہیں رنگنے کے بعد دالوں میں شامل کیا جاتا ہے۔ یہاں سفید پتھر چادلوں میں ڈالنے کے لیے ہیں۔“

اس دوران میں گودام پر کام کرنے والے ملازمین کو بھاگتے اور چھاپہ مارٹیم کے اراکین کو انہیں گرفتار کرتے ہوئے دکھایا جا رہا تھا۔ ٹی وی لاؤنج سے کچن میں جاتی فجر کے پاؤں وہیں پر ساکت ہو گئے کیونکہ وہیں اسے اپنے دونوں بڑے بھائی بھی دکھائی دیے تھے۔

”یہ دروازہ کھولے۔“ اینکر نے مائیک سنبھالے بند دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

”نہیں اس دروازے کے پیچھے کچھ نہیں ہے۔“ پس و پیش سے کام لیا گیا۔

”اس بات کا فیصلہ آپ نہیں ہماری ٹیم کرے گی۔ آپ دروازہ کھولے ورنہ ہم یہ دروازہ توڑ دیں گے۔“

مسلسل انکار کے بعد بالآخر انہیں دروازہ کھولتے ہی بنی۔

”اوہ... ناظرین یہاں دیکھیے... ہمیں بتایا گیا تھا کہ اس دروازے کے پیچھے کچھ نہیں ہے لیکن یہاں مسالہ جات میں ملاوٹ کی جاتی ہے۔ یہ سوکھی لکڑیاں جو اس مشین میں پس جا رہی ہیں۔ انہیں مضرت رنگوں سے رنگین بنا کر مرچ مسالوں میں شامل کیا جا رہا ہے اور تو اور یہ اسی جگہ پرانی منزل واٹر کی بوتلوں میں اس ٹل میں سے پانی بھر کر انہیں سیل کیا جا رہا ہے۔“

”یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟“ مزاحمت کی گئی۔

”یہ سوال تو ہمیں آپ سے کرنا چاہیے کہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ کیسے انسانی زندگیوں کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔ تھوڑے فائدے کے لیے موت کا سودا کر رہے ہیں۔ آپ انسان ہیں؟ کس قسم کے انسان ہیں آپ؟“

اینکر جذباتی جملوں سے ان بے ضمیروں کے ضمیر جگانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ ٹیم کے مختلف لوگ بند بوریوں اور گودام کے مختلف کمروں کا جائزہ لیتے ہوئے ملاوٹ شدہ مال اور جعلی پیکنگ کے سامان سکرین کے سامنے کرتے ہوئے ان کا پول کھول رہے تھے۔ چھوٹے ملازمین کو گرفتار کر لیا گیا تھا ٹیم اب گودام سے ملحق دفتر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ دروازہ کھٹکھٹایا گیا لیکن دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس اثنا میں پولیس کو بھی بلا لیا گیا تھا۔ سپاہیوں نے دروازہ کھولا اور فجر جہاں کی تہاں رہ گئی۔ اس کے ابو اور چچا اور چچا زاد بند دروازے کے پیچھے تھے۔

معاذ نے مڑ کر فجر کو دیکھا جو سکتے کے عالم میں پروگرام دیکھ رہی تھی۔ اپنے تایا اور چچا کی صورت وہ پہچان چکا تھا۔ خالہ جان بھی وہیں آگئیں فجر کی حالت سے وہ واقف تھیں۔ انھوں نے فجر کو اپنے پاس بٹھالیا اسے ساتھ لگائے اس کا حوصلہ بڑھا رہی تھیں۔

”جی ہاں ناظرین! یہی ہیں وہ اصل مجرم جن کی ایما پر وہ تمام ملاوٹ کی جا رہی ہے۔ ان کے چہرے دیکھیے، سفید باریش چہرے، جو ہاتھی کے دانتوں کی طرح کھانے کے اور ہیں، دکھانے کے اور۔ ہاتھ کی تسبیح پکار پکار کر کہتی ہے کہ بغل میں چھری رکھ کر منہ میں رام رام کرنے والے لوگ ہیں یہ.... کیا کہیں گے آپ اس بارے میں؟“

اینکر نے مائیک اس کے چچا کی طرف کیا تھا۔

”آپ یہ سب ٹھیک نہیں کر رہے۔ یوں بغیر وارنٹ کے چھاپہ مارنا کہاں کا انصاف ہے؟“ اس کے چچا غصے میں تھے۔

”اور آپ جو کچھ کر رہے ہیں۔ یہ کہاں کی انسانیت ہے؟ کیسے دین کے پیروکار ہیں آپ؟ ہاتھوں میں تسبیح پکڑے کس کو دھوکا دے رہے ہیں؟ کیا آپ کا دین اس بات کی اجازت دیتا ہے اس طرح رزق کمانے کی، حرام کھا رہے ہیں آپ اور انسانی زندگیوں کے ساتھ کھیل رہے ہیں، کیا یہ سب ٹھیک ہے؟“

”آپ کو یہ سب کہنے کا کوئی حق نہیں۔ یہ ہمارا اور اللہ کا معاملہ ہے ہم باقاعدہ صدقات، خیرات اور نذر



و نیاز سے اپنا رزق پاک کرتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ زکوٰۃ مال کو پاک کرتی ہے۔ آپ اس طرح حرام رزق کا الزام نہیں لگا سکتے ہم پر۔“

”ماشاء اللہ..... سنئے ناظرین ان کے نادر خیالات سنئے... کہاں سے پڑھی ہے آپ نے یہ تفسیر کہ زکوٰۃ حرام مال کو بھی پاک کرتی ہے۔ اور یہ تصویر دیکھیے.....  
”کون ہیں یہ؟۔“

”ہمارے پیرو مرشد ہیں۔“ جواب آیا۔

”اچھا کیا یہ سب انھوں نے آپ کو سکھایا ہے؟۔“

”کیا مطلب یہ سب؟۔“

”اتنے بھولے کیوں بن رہے ہیں... یہ سب جو ملاوٹ اور ذخیرہ اندوزی کا بازار گرم کر رکھا ہے آپ نے اور کہتے پھرتے ہیں کہ اس حرام مال کو زکوٰۃ خیرات کے ساتھ پاک کرتے ہیں... کہاں سے سیکھا ہے یہ طریقہ؟ کیا انھی نے سکھایا ہے۔“ نجر نے دیکھا کہ اس کے والد اور چچا بے بسی سے ہاتھ مل رہے تھے... ہونٹ کاٹ رہے تھے۔ وہ خالہ کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”یہ پیر ذکاء اللہ کی تصویر ہے ناظرین!..... یقیناً یہ انھیں کے ارادت مندگان میں سے ہیں۔ آئیے اب آپ کو کچھ دیر کے لیے واپس اسٹوڈیو لیے چلتے ہیں جہاں آپ کی ملاقات پیر ذکاء اللہ سے کروائی جائے گی ان سے ہم دریافت کریں گے کہ حرام مال کو پاک کرنے کا کون سا شرعی طریقہ ہے جس کی قرآن اجازت دیتا ہے۔“  
پیر ذکاء اللہ نے صاف لفظوں میں یہ سب تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس وقت وہ منافقت کا نقاب اوڑھے قرآن وحدیث کے حوالے بیان کرتے ہوئے ملاوٹ، ذخیرہ اندوزی اور ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے انجام سے آگاہ کر رہا تھا۔ فصاحت و بلاغت کے دریا بہاتے ہوئے اس کے الفاظ میں کوئی ابہام تھا نہ ذومعنویت۔ وہ اپنے پروں پر پانی نہیں پڑنے دے رہا تھا اور قصور وار نجر کے والد اور چچا کو ٹھہرا رہا تھا:

”سمجھ میں نہیں آتا کہ ارمغان میاں نے تعلیمات اسلامی کو یہ رنگ کیوں دیا اور یوں ہم پر تہمت کیوں لگائی۔ ملاوٹ کا جو کاروبار وہ چھپ چھپا کر یہ کرتے رہے ہیں، مذہبی، سماجی اور اخلاقی حوالے سے غلط ہے۔ وہ لوگوں

کی زندگیوں کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔ ایسی کمائی سراسر حرام ہے اور جو حرام ہے اسے حلال کسی طریقے سے نہیں کیا جاسکتا۔ حرام مال سے زکوٰۃ بھی جائز نہیں.... ہم پر تہمت لگا کر انھوں نے ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا بلکہ خود اپنی آخرت کو خراب کیا ہے۔ ہم انھیں اس بات کے لیے معاف کرتے ہیں اور ہماری دعا ہے کہ اللہ بھی ان کے گناہ معاف فرمائے اور انھیں راہِ راست پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔“

اسکر نے بولنا شروع کیا:

”بہت شکریہ جناب ذکاء اللہ!“

ناظرین آپ نے ابھی ذکاء اللہ صاحب کا ملاوٹ اور ذخیرہ اندوزی کے بارے میں بیان سنا.....۔“

فجر کا ضبط جواب دے چکا تھا اس نے ٹی وی بند کر دیا:

”یہ.... یہ ہے وہ شخص! جس کا فرمان ابو جان کے لیے حرف آخر تھا۔ وہ شخص جو اس دنیا میں ان کی حمایت میں ایک لفظ نہیں بول سکا تو آخرت میں ان کی مغفرت کیسے کروائے گا۔ آہ! ابو آپ نے اس شخص کو اپنا ہادی سمجھا جو خود ہدایت سے دور ہے۔ ابو کے ساتھ اچھا نہیں ہوا وہ یہ سب کیسے سہہ پائیں گے“ وہ رونے لگی۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا۔ شکر کرو کہ اس جہان میں کیے گئے غلط کاموں کی سزا انھیں اسی جہان میں مل گئی۔ اب آخرت میں صاف دامن کے ساتھ جائیں گے۔“ خالہ نے کہا۔ وہ معاذ کی طرف دیکھ رہی تھیں کہ شاید وہ بھی فجر کے لیے دو بول تشریف کے بولے لیکن وہ ہنوز چپ تھا۔

”لیکن خالہ! اس شخص کو سزا کیوں نہیں ملی جس نے انھیں ورغلا یا تھا؟ کیا اسے سزا نہیں ملنی چاہیے؟“

”ہم اور تم اس بات کا فیصلہ نہیں کر سکتے کہ کس کو کتنی سزا ملے گی اور کیسے سزا ملے گی۔ یہ سب اللہ کے کام ہیں۔ وہ بہتر جانتا ہے کہ کس کو کب اور کیسے سزا دینی ہے۔ کیا پتا اس کی سزا کا آغاز ہو چکا ہو یا اس کی سزا آخرت تک کے لیے اٹھا رکھی گئی ہو اور اگریں ہے تو ہم جیسے کج فہم اس سزا کی شدت کا اندازہ بھی نہیں سکتے جو اُس جہان میں کسی کو ملے گی۔“

اس نے جھرجھری لی۔ ”آپ ٹھیک کہتی ہیں۔“

”جو ہوا اسے کوئی بدل نہیں سکتا۔ شاید اچھا ہی ہوا کہ اب بھی ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ نقاب اُن کی آنکھوں

سے ہٹ چکے ہیں۔ اب وہ ہدایت پا جائیں گے۔“

”ان شاء اللہ۔“

”میرا خیال ہے یہی درست وقت ہے ہمیں تایا جان کے پاس جانا چاہیے۔ انہیں ہماری ضرورت ہے۔“  
معاذ نے پہلی بار لب کشائی کی خالہ کے اندر کچھ سکون اتر ا۔ وہ بہت دن سے ان دونوں کے درمیان خاموشی کی دیوار کو محسوس کر رہی تھیں اب بھی اگرچہ معاذ نے فجر کو دیکھے بنا مخاطب کیا تھا لیکن یہ طرزِ مخاطب بھی خالہ کے لیے باعثِ اطمینان تھا کہ شاید اسی طرح وہ ان دیکھی برف کی دیوار پگھل جائے۔ فجر نے آنسو پونچھ لیے اور اثبات میں سر ہلایا۔ وہ لباس تبدیل کرنے اندر چلی گئی۔ معاذ نے ٹی وی آن کیا۔ وہاں معاشرتی برائیوں کو بے نقاب کیا جا رہا تھا اور بیک گراؤنڈ میں نعیم صدیقی کی نظم چل رہی تھی:

اے دانش عیار! خدا دیکھ رہا ہے

اے خواہش سرشار! خدا دیکھ رہا ہے

رنگین غلافوں میں چھپاتے ہیں جنہیں ہم

روحوں کے وہ آزار خدا دیکھ رہا ہے

جو سرِ بازار تو ہے سب کی نظر میں

جرم پسِ دیوار خدا دیکھ رہا ہے

رنگینی گفتار سے مسحور ہے محفل

اور غایتِ گفتار خدا دیکھ رہا ہے

جلوت میں تو کچھ پاس رہا خلقِ خدا کا

خلوت میں بھی سرکار خدا دیکھ رہا ہے

ایمان کا عنوان لگا رکھا ہے جس پر

وہ جذبہ بیمار خدا دیکھ رہا ہے

☆.....☆.....☆

اپنی تکمیل کر رہا ہوں میں  
ورنہ تم سے تو مجھ کو پیار نہیں

وہ کمرے میں بکھرا سامان سمیٹ رہی تھی جب معاذ کی کتابوں پر جا بجا یہی شعر لکھا ہوا دکھائی دیا۔ اندر کہیں کچھ چبھاتا تھا لیکن اب عرصہ ہوا اس نے رونا چھوڑ دیا تھا۔ چار سال سے ان دونوں کے رشتے میں سمجھوتے کی دیوار کھڑی تھی۔ حقوق و فرائض کی زنجیر میں بندھے دونوں اس رشتے کی گاڑی کو کھینچ رہے تھے تین سالہ شازل اور ڈھائی ماہ کی آئینہ کے ساتھ نے اس کی شمس زدہ زندگی میں کچھ تازہ ہوا پیدا کر دی تھی لیکن اب بھی ضروری بات چیت کے سوا ان کے درمیان کوئی بات نہ ہوتی۔ معاذ اپنی جاب اور کاروبار میں ایسا الجھتا تھا کہ صبح سے گیا رات گئے واپس آتا۔ خالہ یہ سب نوٹ کر رہی تھیں لیکن ان کا رویہ محتاط تھا۔ وہ کبھی بکھار معاذ کو سمجھاتیں لیکن بار بار کی تکرار سے دانستہ باز رہتیں کہ مبادا وہ چڑ جائے۔ پہلے پہل اس نے اتوار کو بھی دوستوں کے ساتھ کوئی نہ کوئی پروگرام ترتیب دیا ہوتا تھا تا کہ گھر میں کم سے کم وقت گزارے لیکن جب سے شازل کچھ سمجھدار ہونے لگا تھا، معاذ کو اپنی نام نہاد مصروفیت میں کمی کرنا شروع کر دی تھی۔ آئینہ کی پیدائش کے بعد حالات کچھ اور بہتر ہوئے تھے، وہ گھر میں وقت گزارنے کے بہانے تلاش کرنے لگا تھا۔

معاذ کی جانب سے یہ قدرے خوش آئند قدم تھا جس نے اس کے اندر پنپتے عدم تحفظ کے احساس کو کسی حد تک کم کر دیا تھا۔ اب تو اسے لگتا تھا کہ دھیرے دھیرے سب ٹھیک ہو رہا ہے لیکن اس شعر کو دیکھ کر محسوس ہوا کہ جیسے اس کی خوش فہمیوں کا تاج محل ایک ہی جھکے میں زمین بوس ہو گیا ہے۔ سب ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ وہ اب بھی صرف اپنی تکمیل کر رہا تھا۔ اسے محبت نہیں تھی۔ محبت کیا ہوتی ہے؟ اس کے تقاضے کیا ہوتے ہیں؟ رشتوں میں اس کی گنجائش کیا ہوتی ہے؟ اسے سمجھنا مشکل ہو رہا تھا۔ کیا صرف ساتھ رہنے کو محبت کا نام دیا جاسکتا ہے؟ کیا صرف کسی کا خیال رکھنے کو محبت کہا جاسکتا ہے؟ اس کے لیے یہ کرم بھی محبت سے کم نہ تھا، وہ اسی کو محبت سمجھے بیٹھی تھی لیکن اب پتا چلا کہ یہ پیار نہیں صرف اپنی ذات کی تکمیل ہے۔ کسی کی ذات کی تحقیر، کسی کی ذات کی تکمیل۔ آہ..... عجیب سا احساسِ جرم اس کے اندر جا گئے لگا تھا۔ پھر سے دل بوجھل ہو رہا تھا، کئی سوالات ذہن کی زمین پر محشر برپا کر رہے تھے، لیکن جواب دینے والا کوئی نہیں تھا۔ یکدم احساسِ تنہائی رگ و پے میں دوڑنے

لگا تھا۔ وہ خالہ کے ساتھ یہ غم نہیں بانٹ سکتی تھی۔ وہ کسی کو اپنے کرب سے آگاہ نہیں کر سکتی تھی کیونکہ بھرم بھی کوئی چیز ہوتا ہے۔ کسی کے سامنے اپنی ناقدری کا راز کھولنا دوسروں کی نظر میں اپنی ذات کو بے مایہ کرنا ہے جو اسے منظور نہیں وہ کسی پر ظاہر نہیں کرتی تھی کہ معاذ کا رویہ اس کے ساتھ کس قدر تلخ اور تحقیر آمیز ہو جاتا تھا۔ خالہ سب دیکھتی تھیں۔ وہ اسے صبر کی تلقین کرتیں اور اللہ پر بھروسہ رکھنے کا درس دیتیں۔ یہ بھی خالہ کا بڑا پن تھا کہ انھوں نے ان دونوں کے رشتے کی نزاکت کو کبھی اپنی بیٹیوں کے ساتھ بھی ڈسکس نہیں کیا تھا۔ اس لیے وہ سر اٹھا کر اعتماد کے ساتھ سب کا سامنا کرتی تھی۔ تنہائی میں سارا اعتماد ریت کی بھر بھری دیوار کی طرح ڈھسے جاتا تھا۔ نماز کے بعد اللہ سے صبر کی دعا کیا کرتی کہ حوصلہ کہیں ٹوٹ نہ جائے۔ دل تڑپ کے پکارا اٹھتا تھا، ”کبھی اے حقیقت منتظر نظر آلباس مجاز میں۔“ وہ اللہ سے گلا نہیں کر سکتی تھی اس لیے کہ اللہ کا کرم اور اس کا رحم اس پر بے انتہا تھا اور جن حالات کا وہ شکار تھی وہ اس کے اعمال کی بوئی ہوئی فصل تھی۔ جب تک یہ فصل کٹ نہ جاتی۔ اس وقت تک نئی فصل نہیں بوئی جاسکتی تھی۔ وہ صبر اور برداشت کے بیج اپنے اعمال کی زمین میں بور ہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اگلی فصل سکون کی تیار ہونے والی ہے لیکن ابھی اس میں وقت تھا۔ کچھ بھی ہے وقت گزر رہی جاتا ہے۔ اچھا ہو یا برا، ٹھہرا نہیں رہتا۔ جیسے اس کی زندگی کے چار سال گزر گئے تھے لیکن جب انتظار کے یہ لحاظ کٹھن ہونے لگتے، دل و دماغ میں جنگ چھڑتی اور سوالوں کا یہ طوفان بے چین کرنے لگتا تو وہ ان تمام سوالوں کو ڈائری کے شکم میں اتار کر پرسکون ہو جاتی۔ اس طرح جواب بھلے ہی نہ ملتے تھے لیکن دل کا بوجھل پن قدرے کم ہو جاتا تھا۔ اب وہ ڈائری کو بہت چھپا کر رکھتی تھی اس لیے کہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ معاذ کی نظر اس ڈائری پر دوبارہ پڑے اور وہ پھر سے اس کے سچے جذباتوں کو جھوٹ کا پلندہ کہہ کر طنز کے نئے نشتر چھوئیں:

”مجھے کیوں لگتا ہے جیسے میرے ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے لگا ہے۔ میں ساری زندگی بھی انتظار کرتی رہوں تو بھی حالات بہتر نہیں ہوں گے۔ کہنے کو سب مکمل ہے لیکن یہ بے نام تشنگی، یہ احساسِ اذیت، یہ نادیدہ سزا کا سلسلہ..... کب تک یہ سب اسی طرح چلے گا۔ چار سال پہلے معاذ نے کہا تھا کہ شاید سب پہلے جیسا ہو جائے اور میں اس ”شاید“ کی زنجیر میں اب بھی جکڑی ہوئی ہوں لیکن جو باتیں شاید کے ساتھ مشروط ہوتی ہیں وہ یقین کے پل صراط کو دھیرے دھیرے بہت کمزور اور بار یک کرنے لگتی ہیں۔ اس کا اندازہ مجھے ہر گزرتا پل بڑی شد و مد

سے کروارہا ہے۔ ہمت ٹوٹ رہی ہے، ہمت کہیں ٹوٹ نہ جائے۔ آس کا دیا ٹٹمارہا ہے، آس کا دیا کہیں بجھ نہ جائے۔ ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ رہا ہے، ضبط کا دامن کہیں ہاتھ سے چھوٹ نہ جائے۔ ماضی کی ایک غلطی میری کل زندگی کا آزار بن چکی ہے۔ کیا میری عمر بھر کی وفائیں بھی اس غلطی کا کفارہ نہیں بنیں گی؟ کیا میرے ہونے یا نہ ہونے سے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑے گا؟ کیا یہ احساسِ ندامت میرے ساتھ قبر تک میرا پیچھا کرے گا؟ کیا شک بھری معاذ کی نگاہیں ہمیشہ میرے تعاقب میں رہیں گی؟ کیا وہ مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا؟ کبھی نہیں؟ کیا چار سال اسے یقین دہانی کروانے کے لیے کم تھے؟ کیا ساری زندگی بھی کم پڑے گی؟ میں اب تھکنے لگی ہوں۔ مجھ سے اب اور سہا نہیں جاتا، نہ معاذ کی نظر اندازی، نہ ان کی شک بھری نگاہیں، نہ کچھ جتناقی نظریں، نہ طنز بھرے الفاظ۔ میرا دل کرتا ہے اس گھٹن بھرے ماحول سے بھاگ جاؤں لیکن اس بار میں گھر سے فرار کی راہ اختیار نہیں کروں گی بلکہ زندگی سے فرار پا لوں گی۔ میں خود کو ختم.....“

آئینہ کے رونے کی آواز سے الفاظ کا بہاؤ ختم گیا۔ اس کے اندر سے اپنی تحقیر و تذلیل کا احساس دم توڑ گیا، اب صرف وہ ایک ماں تھی۔ آئینہ کو سینے سے لگائے وہ سوچ رہی تھی کہ کیا اس کے لیے زندگی سے فرار پالینا آسان ہوگا۔ ”نہیں“ اندر کوئی بولا تھا۔ وہ اسے سینے سے لگائے پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

☆.....☆.....☆

معاذ گھر میں اکیلا تھا۔ سب لوگ غزالہ آپی کے دیور کی شادی پر گئے تھے۔ دعوت نامہ اسے بھی ملا تھا لیکن اس نے اپنی مصروفیت کی وجہ سے منع کر دیا تھا۔ ویسے بھی وہ فجر کے ساتھ کسی فنکشن میں جانا بہت عرصہ پہلے ہی چھوڑ چکا تھا۔ آج کتنے ہی عرصے کے بعد گھر میں خاموشی اسے کاٹنے کو دوڑ رہی تھی۔ ٹی وی دیکھنے اور موبائل فون پر گیم کھیلنے کی تمام سرگرمیوں سے فارغ ہو کر بھی اسے نیند نہ آئی تو نظر کتابوں کے ریک کی طرف اٹھی، یہی خیال تھا کہ کسی کتاب کا مطالعہ کرے گا اور سو جائے گا۔ کتاب کھوجتے ہوئے ڈائری پر نظر پڑی۔ نخوت سے ایک نظر ڈالی:

”تویہ خرافات لکھنے کا سلسلہ ابھی بھی جاری ہے۔“

وہ کتاب لیے بستر کی طرف بڑھ رہا تھا کہ کسی نادیدہ طاقت نے اس کا رخ موڑ دیا اور وہ ڈائری لے کر بیٹھ

”آج پورے دس ماہ بعد میں نے اپنے گھر میں قدم رکھا تھا۔ حیرت کا جھٹکا میرا منتظر تھا۔ میرے گھر والے جانتے تھے کہ میں مری نہیں بلکہ گھر سے بھاگ گئی ہوں۔ انھوں نے اپنی عزت بچانے کے لیے میری موت کی خبر پھیلا دی تھی۔ ابو کو میں نے اتنی ٹوٹی اور بکھری ہوئی حالت میں دیکھا کہ میں لمحہ بھر کو دم بخود رہ گئی۔ ان کے اعتقاد کی دھجیاں اڑی تھیں۔ ان کے لیے سنبھلنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ اپنی سماجی زندگی ترک کر چکے تھے۔ کسی کا سامنا کرنے کی سکت نہیں تھی ان میں۔ انھوں نے مجھے معاف کر دیا، اتنی آسانی سے۔ اس لیے کہ انھیں لگتا تھا کہ میرے اس قدم کے پیچھے ان کے برے اعمال کا ہاتھ تھا۔ معاذ سے میرا کھوکھلا رشتہ مجھے میرے میکے میں معتبر کر رہا تھا۔ چچا چچی، چچا زاد اور میرے اپنے بھائی سب یہی سمجھ رہے تھے کہ میں دادی کے بنائے رشتے کو بچانے کے لیے گھر سے نکلی تھی۔ معاذ خاموش رہے لیکن ان کی آتش انگیزی نگاہیں میرے وجود کو جلا کر خاک کر رہی تھیں۔ میں وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی لیکن چپ چاپ سب سہتی رہی۔

یہ آخری موقع تھا جب معاذ میرے ساتھ کہیں گئے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے میرے ساتھ کہیں بھی جانا چھوڑ دیا۔ ٹی وی پر چلنے والے پروگرام کی ذلت کے اثرات گھر کے ہر فرد پر دکھائی دے رہے تھے لیکن اس سے بڑا دکھ یہ تھا کہ پیر ذکاء اللہ نے کسی معاملے میں کوئی ذمہ داری قبول نہیں کی تھی اور جس ”کاروبار“ کو انھوں نے پیر ذکاء اللہ کی ہدایت پر شروع کیا تھا اسے ابوجان کی اُجج قرار دے کر خود اس سارے معاملے سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ بھائیوں نے سب کچھ چھوڑ کر کسی اور ملک میں رہائش اختیار کرنے کا ارادہ کر لیا تھا لیکن ابوجان اس کے لیے راضی نہیں لیکن مجھے لگتا ہے کہ ابوجان کا یہ انکار زیادہ دیر تک برقرار نہیں رہے گا۔ کچھ بھی ہے امی کے بغیر اب شاید میں اس گھر میں دوبارہ نہ جا پاؤں۔ سب کچھ پر ایسا لگنے لگا ہے۔ یادِ ماضی عذاب ہے اور وہ درود یوار مجھے پھر سے ماضی یاد دلاتے ہیں۔ میں اب وہاں نہیں جاؤں گی۔ جو قصہ ختم ہو چکا ہے اسے دہرانے کی بھلا ضرورت بھی کیا ہے۔ زمانے کی نظر میں اس گھر کی بیٹی مرچکی ہے تو یہی سہی۔ ویسے بھی میں زندہ کب ہوں۔ مجھے تو معاذ کی متشکک نگاہیں روز مار دیتی ہیں۔“



”آج شازل کے اسکول میں پرنٹس ڈے تھا۔ معاذ نے ہمیشہ کی طرح میرے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ میں تو جانتی تھی کہ وہ نہیں جائیں گے اس لیے کہ میرے ساتھ کہیں جانا انھیں اپنی توہین لگتا ہے لیکن شازل کے سوالوں کا جواب دینا میرے لیے کتنا مشکل ہوتا ہے یہ بات معاذ نہیں سمجھتے۔ پتا نہیں وہ ایسے سوال صرف مجھ سے ہی کرتا ہے یا ان سے بھی کرتا ہے؟ وہاں مجھے مریم بھی ملی تھی۔ مریم، زہرا کی سہیلی... کتنی بدل گئی تھی وہ... اس کا بیٹا بھی اسی اسکول میں پڑھتا ہے۔ شازل کی کلاس میں۔ اس نے مجھے زہرا کے بارے میں بتایا اس کی حالت، لمحہ بھر کو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے... مجھے چار سال پہلے مارکیٹ میں ملی وہ بھکارن یاد آ گئی... تو... تو وہ واقعی زہرا تھی، میرا شک ٹھیک تھا۔ یہ سب سن کر میری روح لرز اٹھی تھی۔ زہرا سے بھی تو وہی گناہ سرزد ہوا تھا جو مجھ سے ہوا۔ لیکن میں بھٹک کے بھی سنبھل گئی، اللہ نے مجھے بچا لیا، میری سزا اتنی بھیا تک نہیں جتنی زہرا کو ملی۔ آہ... اللہ کا میں جتنا بھی شکر ادا کروں وہ کم ہے۔“



”آج شاپنگ مال میں امینہ بھابھی کو ایک بوتیک میں دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔ ماضی بھولنے کی لاکھ کوشش کرو کسی نہ کسی روپ میں سامنے آئی جاتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ عذرا جہاں معذور ہو چکی ہیں۔ انھوں نے جائیداد اپنے بچوں میں تقسیم کر دی ہے۔ فضیل ہمیشہ کے لیے ملک چھوڑ کر جا چکا ہے۔ چلو اچھا ہوا۔ کاش یہ بات کوئی معاذ کو بھی بتا دے تاکہ ان کو یقین آ جائے کہ اب وہ کبھی اس دروازے پر دستک نہیں دے گا۔ کاش وہ اس روز میرے گھر نہ آیا ہوتا تو شاید میری زندگی اس امتحان کا شکار نہ ہوئی ہوتی۔ کاش میں اپنا دل چیر کر معاذ کو دکھا سکوں کہ میرے دل میں کہیں فضیل کا کوئی مقام نہیں۔ کاش..... چلو امینہ بھابھی کے ساتھ اچھا ہو گیا انھوں نے میری مدد کی تھی۔ اللہ نے اس کا اچھا اجر دیا اب وہ اپنی بوتیک کی مالک ہیں۔ ان کے بچے اچھے سکولوں میں پڑھ رہے ہیں۔ انھیں معاشی تحفظ حاصل ہو گیا۔ بہت اچھا ہوا۔ اللہ کسی کی نیکی ضائع نہیں کرتا۔ لیکن میں نے عذرا جہاں کو کوئی بددعا تو نہیں دی تھی پھر.... اللہ بہتر جانتا ہے کہ انھیں کس بات کی سزا ملی۔ میں نے سب کو دل سے معاف کیا۔ اللہ بھی معاف کرے اور میری یہ آزمائشیں ختم کرے۔“



”ان آنکھوں نے یہ دن بھی دیکھنا تھا۔ پیر ذکاء اللہ کی تباہی کا منظر۔ کل اخبار میں شیردل کی موت کی خبر چھپی تھی۔ کسی انجان دشمن نے اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ پیر ذکاء اللہ اپنے اکلوتے بیٹے کی موت کی خبر سن کر دل کا دورہ پڑنے کی وجہ سے دنیا چھوڑ گیا۔ آخر انجام یہی ہے۔ ہر کسی کے ساتھ یہی تو ہونا ہے پھر انسان کیوں اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتا اب نجانے اس کے سلسلے کو کون چلائے گا۔ جھوٹ اور دروغ گوئی کا یہ سلسلہ کب تک چلے گا اور کب تک لوگ ان کے جال میں پھنس کر اپنے رب سے دور ہوتے رہیں گے۔ کب کم عقلوں کو سمجھ آئے گی کہ اللہ اور بندے کے تعلق کے لیے کسی واسطے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ساری بات جذبوں کی سچائی کی ہوتی ہے۔ جذبے تو انا ہوں تو من اور تو کے فاصلے مٹ جاتے ہیں۔ جذبے بیمار ہوں تو آسمان سے زمین کا فاصلہ بہت زیادہ ہے۔ بہت دور۔ اتنا ہی دور جتنا میرا اور معاذ کا ساتھ ہے۔ اللہ کو ماننا آسان ہے۔ بندے کو ماننا بہت مشکل ہے۔ اللہ کے آگے رونے گڑ گڑانے سے سکون ملتا ہے۔ بندے کے آگے رونے گڑ گڑانے سے سکون چھن جاتا ہے۔“

☆.....☆.....☆

وہ حرف بہ حرف اس کی تحریر پڑھتے ہوئے اس کے کرب کو اپنے اندر اترتا محسوس کر رہا تھا۔ چار سال پہلے جب اس نے اس کی تحریر پڑھی تھی تو اسے جھوٹ کا پلندہ محسوس ہوا تھا لیکن آج لفظوں کی تاثیر تھی جو اس کے برف وجود کو لمحہ بہ لمحہ پگھلا رہی تھی۔ لفظ احساسات سے بھرپور ہوں تو اثر دکھاتے ہیں۔ معاذ بھی ان الفاظ کی سچائی سے متاثر ہو رہا تھا۔ صرف متاثر نہیں ہو رہا تھا بلکہ اپنی غفلت پر پشیمان بھی تھا۔ ایک طرف وہ تھی جو سراپا صبر بنی خاموش اپنی سزا کے ختم ہونے کا انتظار کر رہی تھی دوسری طرف وہ خود تھا جو رعونت میں اسے مسلسل نظر انداز کیے جا رہا تھا۔ دیکھا جائے تو وہ اس کی سزا وار نہیں تھی۔ پھر وہ نجانے اسے کس بات کی سزا دے رہا تھا۔ وہ اس کا گھر سنبھال رہی تھی، بچے پال رہی تھی، اس کی ضروریات کا خیال رکھتی تھی، بنا کہے اس کی ضرورت کی ہر چیز اس کے سامنے ہوتی تھی لیکن وہ مسلسل اس کی ضروریات سے بے نیازی برتا کیونکہ اسے پتا تھا کہ خالہ اس کی یہ ذمہ داری بخوبی نبھا رہی ہیں۔ ہاں جو چیز وہ نہیں بھولا تھا وہ اسے ہر پل جتنا کہ وہ گھر سے بھاگی ایک لڑکی ہے۔ آئینہ کی پیدائش پر بھی معاذ نے اس کو بیٹی کی تربیت کے حوالے سے طنز بھرا المبا چوڑا لیکچر دیا تھا جیسے وہ خاموشی

سے سنتی رہی تھی۔ بنا کچھ کہے، بنا کوئی شکایت کیے۔ اب اس کی ڈائری سے پڑھے جانے والے یہ الفاظ اسے لرزائے تھے:

میرادل کرتا ہے اس گھٹن بھرے ماحول سے دور بھاگ جاؤں لیکن اس بار میں گھر سے فرار کی راہ اختیار نہیں کروں گی بلکہ زندگی سے فرار پالوں گی۔ میں خود کو ختم.....“

وہ یہ کیا سوچے بیٹھی ہے۔ اگر اس نے ایسا کچھ کر لیا تو.....؟ اس کے دل کو کسی نے جکڑ لیا۔ ننھا شازل اس کی نگاہوں کے سامنے آ گیا جس کی بات ماما سے شروع ہو کر ماما پر ختم ہوتی تھی۔ چھوٹی سی آئینہ جوماں کے ایک لمس سے رونا بھول جاتی تھی۔ ایک اس کے نہ ہونے سے یہ آشیانہ بکھر جائے گا۔ کمرے کی چار دیواری اور گھر کا ہر کونہ اس کے وجود کے احساس سے مہک رہا تھا۔ یکدم یہ خیال کہ وہ نہ رہی تو..... اس کے لیے یہ سوچنا بھی محال تھا۔ اس نے اپنی سوچ کو واضح تنبیہ کی۔ خود کو لتاڑا۔ اپنی کوتاہیوں پر خود کو ملامت کی اور پھر ڈائری کے خالی صفحات پر معاذ کا قلم چلنے لگا۔

☆.....☆.....☆

”سوری.....“ بے یقینی سی بے یقینی تھی۔

شازل اسکول اور معاذ دفتر جا چکے تھے، خالہ نیچے بچیوں کو قرآن پڑھا رہی تھیں، آئینہ سو گئی تو وہ کمرے کو صاف کرنے لگی۔ بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر پڑی ڈائری دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔ اسے تو اس نے پرانی کتابوں کے بیچ چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ یہاں کیسے آ گئی۔ ڈائری میں قلم بھی رکھا تھا۔ معاذ نے اس کی ادھوری تحریر کو کاٹ دیا تھا جس میں اس نے مرنے کی بات کی تھی۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ بیڈ کے کونے میں بیٹھ گئی اور معاذ کی تحریر پڑھنے لگی:

”شاید سوری بہت چھوٹا لفظ ہے لیکن میں اس لفظ کے علاوہ کوئی اور لفظ تلاش بھی نہیں کر پا رہا، اس کیفیت کو بیان کرنے کے لیے، جس سے میں ابھی گزر رہا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھوں۔ مجھے تمہاری طرح لکھنے کی عادت نہیں ہے ناں۔ پتا نہیں مجھے کیوں لگتا تھا کہ تم نے اپنے اور فضیل کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا وہ سب سچ نہیں ہے۔ تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو اور یہی سوچ ہر بار میرے غصے کو بڑھا دیتی تھی۔ آج اتفاق سے دوبارہ تمہاری اجازت کے بغیر میں نے ڈائری پڑھی تو احساس ہوا کہ میں کتنا غلط تھا۔ تم ٹھیک کہتی ہو کہ اپنا احتساب کرنا

بہت مشکل ہوتا ہے۔ اپنی غلطیوں کو تسلیم کرنا آسان نہیں ہوتا۔ خود اپنی نظروں کا سامنا کرنا بھی مشکل ہوتا ہے اور کسی اور سے نظر ملانا اور بھی مشکل۔ اس لیے معذرت کے لیے وہی طریقہ اختیار کر رہا ہوں جو تم نے چار سال پہلے کیا تھا۔ میں نے تمہارے لفظوں کی سچائی کو نہیں مانا تھا اور اپنی زندگی کے چار سال کھو دیے۔ اب فیصلہ تمہیں کرنا ہے کہ آئندہ زندگی کو کس ڈھب سے گزارنا ہے۔ تم ٹھیک کہتی ہو کہ شازل واقعی بڑا ہو رہا ہے، اس کے سوالوں کا جواب دینا واقعی مشکل ہو جاتا ہے۔ ہمیں اس کے سوالوں کا جواب مل کر تلاش کرنا چاہیے۔ بچوں کی شخصیت کی تعمیر کے لیے ہمیں اپنے اختلافات بھلانے ہوں گے۔ دیکھو! میں پھر خود غرض ہونے جا رہا ہوں۔ تمہیں سزا دینے کے بعد اب اپنی سزا کا وقت آیا تو جذباتی جملوں سے بچوں کی آڑ لے کر رعایت مانگ رہا ہوں۔ نہیں میں تمہیں اس طرح جذباتی نہیں کرنا چاہتا۔ تمہیں سزا دینے کا پورا اختیار دیتا ہوں۔ سر تسلیم خم ہے، جو مزاج یار میں آئے۔“

ڈائری کے صفحات پر اس کے آسو گر رہے تھے۔ دل سے سارا بوجھ سرک گیا تھا۔ اب وہ لبوں پر مسکراہٹ لیے معاذ کے لیے سزا سوچ رہی تھی۔ بہت دیر سوچ کر یہی لکھ پائی:

”سزا کا حق محفوظ ہے۔ سوچ کر تجویز کروں گی۔“

ڈائری پر یہ آخری سطور لکھ کر اس نے ڈائری کو اس سائیڈ پر رکھ دیا جہاں معاذ سوتے تھے۔ اب وہ وضو کرنے جا رہی تھی کیونکہ اس پر سجدہ شکر واجب ہو چکا تھا۔ کدورتیں دھل جائیں تو دلوں کے آئینے شفاف ہو جاتے ہیں۔ جن میں سچے جذبوں کی جھلک بند آنکھوں سے بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

